حویلی کے بھوت

حویلی کے بھوت

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس

مجلسِ ادارت

حکیم محمد سعید

مسعود احمد برکاتی ------ رفیع الزماں زبیری

ناشر : ہمدرد فاؤنڈیشن پریس
ہمدرد سنٹر ناظم آباد، کراچی

طابع : ماس پرنٹرز۔ کراچی

اشاعت : ۱۹۸۸ء

تعدادِ اشاعت : ۲۰۰۰

قیمت : ۸ روپے

پیش لفظ

جس طرح ساری دُنیا کا اندھیرا بھی ایک چھوٹے سے چراغ کی روشنی کو مٹا نہیں سکتا اسی طرح ایک اچھی کتاب کے سامنے جہالت کے اندھیرے نہیں ٹھیر سکتے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کتاب اور علم کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ علم آدمی کو انسان بناتا ہے، اشرف بناتا ہے، بُرے اور بھلے کی تمیز سکھاتا ہے اور کتاب ذہن کو جِلا بخشتی ہے، کتاب ذہن کو روشن کرتی ہے!

کتاب ایک اچھی ساتھی ہے، کتاب ایک سچا دوست ہے۔ اچھا دوست وہی ہوتا ہے جو دوست کا بھلا چاہتا ہے۔ دوست یہ چاہتا ہے کہ ہم صاحبِ کردار ہوں، ہم میں امانت ہو، دیانت ہو، عدالت ہو۔ ہمارے اخلاق ایسے اچھے ہوں کہ سب ہمیں پسند کریں۔ ہماری ذات سے کسی کو دُکھ نہ پہنچے۔ اچھی کتاب ہمیں ایسا ہی اچھا انسان بننا سکھاتی ہے۔

جس طرح دُنیا میں اچھے اور بُرے لوگ ہیں، اسی طرح کتابیں بھی اچھی اور بُری ہوتی ہیں۔ اچھوں کی صحبت اچھا بناتی ہے اور بُروں کے پاس بیٹھ کر تو آدمی بُری باتیں ہی سیکھتا ہے۔ تمھیں ہمیشہ اچھی کتابیں تلاش کر کے پڑھنی چاہییں تاکہ تم اچھے بنو۔

بچے مجھے عزیز ہیں۔ وہ سب میرے ہیں۔ میری خواہش ہے، اور میں چاہتا ہوں کہ میرے کشورِ حسین کے نونہال نیک ہوں، اچھے ہوں، سچے ہوں، بہادر ہوں اور ہمیشہ علم کی جستجو میں رہیں۔ اسی لیے ہمدرد نے "نونہال ادب" کا یہ سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس منصوبے کے تحت تفریحی، معلوماتی سائنسی، دینی، اخلاقی، تاریخی اور ہر قسم کی مفید، معیاری اور خوش نما کتابیں آسان زبان میں شائع کی جا رہی ہیں کہ جن کے مطالعے سے ہمارے نونہال تفریح کے ساتھ ساتھ اپنے ذہن کو روشن اور اپنے اخلاق کو سنوار سکیں۔

یہ کتاب نونہال ادب کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

(حکیم محمد سعید)

فہرست

حویلی کے بھوت

"کمال ہے! ابھی تک چچا جان نے ہمارے خط کا جواب نہیں دیا۔" عابد نے درخت پر چڑھے چڑھے جیسے خود سے کہا۔ وہ اپنے گھر سے کوئی تیس گز کے فاصلے پر ایک اونچے سے درخت پر چڑھا ہوا تھا۔

اُس کا بڑا بھائی، زاہد اس سے بھی اوپر ایک اور شاخ پر بیٹھا تھا۔ اس کے پاس اس کی دُوربین تھی، جس سے وہ دُور سے آتے ہوئے ایئر فورس کے جہازوں کو دیکھ رہا تھا۔

عابد کو تو اُس خط کے جواب کی فکر تھی، جو اُس نے دس پندرہ روز پہلے اپنے چچا حامد حسین خان کو بھیجا تھا۔

عابد گیارہ برس کا تھا اور زاہد اُس سے دو تین سال بڑا۔ انھوں نے اپنے چچا کو لکھا تھا کہ اب کی چھٹیاں یہ لوگ ان کے پاس گزارنا چاہتے ہیں۔ ان کے چچا حامد حسین خان فاریسٹ آفیسر تھے اور شمالی علاقے میں جنگلات کی دیکھ بھال پر تعینات تھے۔ انھیں اپنے ان دونوں بھتیجوں سے بہت محبت تھی۔ اور اکثر وہ انھیں اپنے پاس بلاتے رہتے تھے۔ اور بچے بھی ان کے پاس جاکر چھٹیاں گزار کر بہت خوش ہوتے تھے۔

حامد حسین خان کی بیوی، شادی کے چند ماہ بعد ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں۔ اس کے بعد انھوں نے شادی نہیں کی۔ وہ جنگلات کے کام میں رہتے۔

چڑیوں اور جانوروں سے انھیں بہت دل چسپی تھی۔ انھیں اپنی اس زندگی

سے پیار تھا اور اسی میں وہ مطمئن تھے۔ اپنی اس دل چسپی کی وجہ سے انھیں جنگلی جانوروں کی عادتوں اور خصلتوں کے بارے میں بھی خاصی معلومات تھی۔

کبھی کبھار اپنی عادت کے خلاف انھیں شکار بھی کرنا پڑتا۔ انھوں نے کئی آدم خور جانور بھی مارے، اس کی وجہ سے آس پاس کے گاؤں میں ان کی بڑی عزت تھی۔ وہ اپنی اور اپنے دوست کی شکاری زندگی کے تجربات بڑے مزے لے لے کر سناتے۔ وہ مشہور شکاری جم کاربٹ کی طرح تھے۔ عابد اور زاہد کبھی کبھی ان کو جم کاربٹ کے نام سے پکارا کرتے۔

عابد نے کہا، "تمھارا کیا خیال ہے؟ کیا خط راستے میں کہیں کھو گیا ہوگا؟"

"نہیں۔" زاہد نے جواب دیا۔ وہ اب بھی دوربین لگائے دور دیکھ رہا تھا۔

عابد اس کے جواب سے مطمئن نہ ہوا۔ "بتاؤ نا۔ تمھیں یہ کیسے پتا کہ خط کہیں کھویا نہیں۔"

"بس! چھٹی حس کہہ لو۔ یا کوئی تمھارے اندر تمھیں بتائے کہ یہ یوں ہو گا یا نہیں۔"

عابد نے غیر یقینی کے انداز سے بھائی کو دیکھا۔ "چچا جان، ہمیشہ خط کا جواب دیتے ہیں۔ اس دفعہ انھوں نے کیوں نہیں دیا۔"

"مجھے ڈاکیا آتا دکھائی دے رہا ہے۔" اچانک زاہد نے کہا۔

عابد نے فوراً ہی درخت سے چھلانگ لگائی، تاکہ ڈاکیے کو گیٹ پر ہی جا لے۔ مگر ڈاکیا ان کے گیٹ کے پاس سے گزر گیا۔ مایوسی سے عابد واپس آگیا۔ ابھی وہ درخت پر چڑھ ہی رہا تھا کہ اسے گاڑی کی آواز آئی۔ اس نے دیکھا ایک جیپ دھول اُڑاتی چلی آرہی ہے۔

"یہ چچا جان ہیں۔" دونوں ایک ساتھ چلّائے اور جلدی سے درخت سے کود کر گھر کی طرف بھاگے۔

یہ چچا جان ہی تھے۔

"کیسے ہو! بچو! ٹھیک ٹھاک۔"

"بالکل ٹھیک۔ چچا جان! کیا آپ کو ہمارا خط نہیں ملا تھا؟" عابد نے پوچھا۔

"ملا تھا۔ بالکل ملا تھا۔ جبھی تو میں یہاں آیا ہوں۔" انھوں نے عابد کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

عابد نے غور سے بھائی کی طرف دیکھا۔ اس کی چھٹی حس کتنی صحیح تھی۔ دونوں بچے چچا کے آنے سے بے حد خوش تھے۔ مگر ایک بات انھیں پریشان کر رہی تھی، چچا جان ہمیں بلانے کے بجائے، خود کیوں آگئے؟ کیا وہ اپنی چھٹیاں یہاں گزارنا چاہتے ہیں؟

جب چچا جان اپنی بندوق کے ساتھ جیپ سے اترے تو عابد نے پوچھا، "چچا جان! آپ ہمارے پاس چھٹیاں گزارنے آئے ہیں؟"

"نہیں بھئی۔ ہمیں تمھاری طرح چھٹیاں نہیں ملتیں۔" چچا جان نے کہا، "میں تو سرکاری کام سے آیا ہوں۔"

وہ بھی جانتے تھے کہ ان کے یہاں آنے سے بچوں کو مایوسی ہوئی ہوگی۔ تبھی انھوں نے کہا، "میں اس لیے بھی آیا ہوں کہ تم دونوں کو کل اپنے ساتھ لے جاؤں۔ ہم کل صبح ہی روانہ ہو جائیں گے۔"

یہ خبر سنتے ہی دونوں میں جیسے بجلی بھر گئی اور وہ خوشی سے دوڑتے ہوئے امی کو یہ خبر سنانے گھر کے اندر چلے گئے۔

۲

نہا دھو کر، تیار ہو کر حامد حسین خان تو پلاننگ کمیشن کے دفتر چلے گئے۔ ان کے ساتھ زاہد کے ابو شاہد حسین بھی تھے۔ جاتے جاتے وہ اپنے نوکر جمن کو جیپ دھونے کا کہہ گئے۔

جمن، حامد حسین کے ساتھ رہتا تھا۔ ان کے لیے کھانا پکاتا اور دوسرے کام کرتا۔ یہ کوئی پندرہ برس سے ان کے ساتھ تھا۔

ٹامی، ان کا دوسرا ساتھی تھا، یعنی ان کا پالتو کتا۔ یہ بھی شکار کے علاوہ جہاں جہاں حامد حسین خان جاتے ان کے ساتھ جاتا۔ ٹامی اب بوڑھا ہو چلا تھا۔ اس کی عمر بارہ برس تھی۔ اب یہ اتنا چُست چالاک نہ رہا تھا جتنا کہ پہلے کبھی تھا اور نہ بھاگ بھاگ کر یہ اپنے مالک کے ساتھ شکار کرتا تھا، مگر اب بھی یہ خاصا ٹھیک ٹھاک تھا۔

زاہد اور عابد نے اپنی امی کے ساتھ مل کر اپنا سامان ٹھیک کیا۔ زاہد نے خاص طور سے اپنی دوربین رکھی، کیوں کہ اُسے چڑیوں کو اڑتے دیکھنا بہت پسند تھا۔ عابد نے اپنی کتابیں اور اپنا پینٹنگ کا سامان رکھا اور ساتھ ہی ایک چھوٹا سا کیمرا بھی۔ یہ کیمرا اس کے ابو نے اسے پچھلی سالگرہ پر دیا تھا۔ عابد اس بات سے بہت خوش تھا کہ اس کے چچا جان کے پاس شکار، سیاحت اور تاریخ پر بہت سی کتابیں تھیں اور وہ پڑھنے کا خاصا شوقین تھا!

سب سامان رکھنے کے بعد دونوں بھائیوں نے نے دوستوں کو اللہ حافظ کہنے کا ارادہ کیا۔

"تم پہلے کھانا تو کھا لو۔ گھنٹہ بھر میں تیار ہو جائے گا۔" امی نے کہا۔

"نہیں امی! ہم پہلے دوستوں سے مل آئیں۔"

"پھر کھانے کے وقت تک آجانا۔"

"ہم کوشش کریں گے اور اگر کھانے تک نہ آئے تو آپ لوگ کھا لیجیے۔ ہم اپنے دوستوں کے ہاں کھا لیں گے۔"

"اچھا۔" امی نے کہا۔

دونوں بھائی سائیکلوں پر بیٹھ کر دوستوں کی طرف چلے گئے۔

شام کو جب یہ لوگ واپس لوٹے تو سب لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

"تم نے کبھی نیولے کو سانپ مارتے دیکھا ہے؟" چچا نے باتوں باتوں میں عابد سے پوچھا۔

"نہیں چچا جان۔ کیا آپ نے دیکھا ہے؟" عابد نے پوچھا۔

"ہاں۔ آج ہی صبح میں نے راستے میں دیکھا کہ ایک نیولے نے سانپ کو مار دیا۔" چچا نے کہا۔

"بتائیے نا چچا جان۔ پورا واقعہ سنائیے۔" عابد نے کہا

"اتفاقاً ہی میں نے یہ زبردست لڑائی دیکھی۔ راستے میں میں نے ایک نیولا دیکھا تو جیپ روک لی۔ وہ ایک طرف کو جا رہا تھا۔ اچانک نیولا رُک گیا۔ اس کے بال کھڑے ہو گئے۔ اب مجھے پتا چلا کہ وہ کیوں بھاگتے ہوئے اس طرح رُک گیا تھا؟ سامنے سے ایک کوبرا سانپ آ رہا تھا جسے اُس نے دیکھ لیا تھا۔"

بچے آنکھیں پھاڑے حیرت سے یہ قصہ سُن رہے تھے۔

"نیولا اور سانپ تو ہمیشہ سے ایک دوسرے کے دُشمن ہیں۔" زاہد نے کہا۔

چچا جان نے کہا، "ہاں یہ دونوں ایک دوسرے کے جانی دُشمن ہیں۔ انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ مگر کسی نے بھی حملہ کرنے میں جلدی نہ دکھائی۔ نیولا پہلے آہستگی سے پیچھے ہٹا، تاکہ سانپ کو زیادہ جگہ مل سکے۔ پھر کھیل شروع ہو گیا۔ دونوں ہی ایک دوسرے کی حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ پھر سانپ آگے بڑھا اس نے اپنا سر کوئی

ایک فٹ زمین سے اُٹھایا پھر اس نے پھن اِدھر اُدھر گھمانا شروع کیا۔ مگر نیولا بھی بہت چالاک تھا۔ پھُرتی سے اِدھر اُدھر ہو جاتا اور سانپ کا ہر وار خالی جاتا۔ یہ اتنی دیر تک ہوتا رہا کہ سانپ بالکل تھک گیا۔ اب نیولے کے حملہ کرنے کی باری تھی۔ اس نے ہوا میں چھلانگ لگائی اور سانپ کو گردن سے پکڑ لیا۔ اتنی طاقت سے اس نے اپنے دانت سانپ کی گردن میں گاڑے کہ اُسے سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔"

"کبھی نیولا بھی تو ہار جاتا ہوگا۔" عابد نے کہا۔

"ہاں، اگر وہ سانپ کی گردن پکڑنے میں ناکام ہو جاتا تو اس سے پہلے کہ سانپ اسے ڈس لے وہ اس کی دُم کی طرف چھلانگ لگا دیتا۔ اس جانور کی پھُرتی قابلِ دید ہے۔"

پھر، بعد میں چچا جان نے کھانے پر انھیں اپنا ایک اور دل چسپ تجربہ سنایا۔ کہنے لگے:

"سال ہی کی پہاڑیوں کے پاس میں نے ایک چیتے کے بارے میں سُنا کہ کس طرح یہ لوگوں کو ہراساں کر رہا ہے اور بے شمار بھیڑیں اور کتے کھا چکا ہے۔ اور اب آدمیوں پر بھی حملے کرنے لگا ہے۔ میں نے ہفتہ بھر کی کوشش کے بعد ایک روز اسے جھاڑیوں میں پالیا اور زخمی کر دیا۔"

یہ سُن کر عابد کی امی خاصی پریشان ہو گئیں۔

"دیکھو! تم چچا جان کی اجازت کے بغیر گھر سے نہ نکلنا۔" انھوں نے تنبیہ کی۔

"ہاں بھئی، ان کے ساتھ باڈی گارڈ ہونا چاہیے۔" ابو نے مسکرا کر کہا۔

چچا جان بھی مسکرائے، "تم کو وہاں زیادہ دُور جانے کی اجازت نہ ہوگی۔"

زاہد اور عابد کے منھ لٹک گئے۔ وہ اب اتنے چھوٹے بھی نہیں تھے۔ پھر بھی انھوں نے ابو امی سے وعدہ کیا کہ وہ محتاط رہیں گے اور کسی مشکل میں نہ پھنسیں گے۔

۳

اگلے روز صبح سویرے یہ دونوں چچا جان اور جمن کے ہمراہ جیپ پر روانہ ہوئے۔ زاہد اور عابد چچا جان کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھے اور جمن اور ٹامی پیچھے۔

شہر کی حد سے نکلتے نکلتے خاصی صبح ہو چکی تھی۔ سورج نکل آیا تھا۔ لوگ بھی جاگ اُٹھے تھے۔ دودھ والے، سائکلوں پر دودھ کے بڑے بڑے ڈبّے لٹکائے دودھ دینے نکلے ہوئے تھے۔ گاڑیوں پر سبزیاں اور پھل دیہات سے شہر کی طرف آ رہے تھے۔ سڑک پر ٹریفک کا شور تھا۔ بڑے بڑے ٹرک بھاری سامان سے لدے ہوئے شور مچاتے گزر رہے تھے

جب گاڑی اور آگے گئی تو ٹریفک کا زور کم ہو چکا تھا۔ جیپ نے بھی رفتار پکڑ لی اور اب ڈرائیونگ کا صحیح لطف آ رہا تھا۔ ان لوگوں کے پاس آج کا سارا دن تھا جس میں انھیں چچا جان کے ہیڈ کوارٹر کا راستہ طے کرنا تھا۔

شہر سے باہر ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بہت اچھے لگ رہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف، جہاں تک نظر جاتی لہلہاتے کھیت تھے۔ سورج کی روشنی میں درختوں کے پتّے چمک رہے تھے۔ سرسوں کے کھیتوں میں پیلے پیلے پھول اپنی بہار دِکھا رہے تھے۔ نیلا آسمان، پیلے پھول، ہرے پتّے مل کر بہت ہی خوب صورت منظر پیش کر رہے تھے۔ کہیں کہیں بڑے درخت بھی تھے۔ گاؤں میں لوگ چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔

جیسے جیسے جیپ پہاڑوں کے قریب آتی گئی، منظر بدلتا گیا۔ اب سڑک غیر ہموار اور پتھریلی تھی۔ پیڑ بھی لمبے اور سیدھے سیدھے تھے۔ طرح طرح کے درخت اور پہاڑی علاقے کو دیکھ کر بچّے خوش ہو رہے تھے۔

چچا جان کوئی خوب صورت منظر دیکھتے تو جیپ روک دیتے۔ کبھی کسی پرانی عمارت کو دیکھ کر عابد اُن کی تصویریں کھینچتا۔ پرانی تاریخی عمارتیں اور کھنڈرات ہمیشہ سے عابد کو پسند تھے۔ اس کو مصوّری سے بھی خاصی دل چسپی تھی۔ کئی جگہ چچا جان نے جیپ روکی اور عابد نے ان کھنڈرات کی تصویریں کھینچیں۔

راستے میں ایک جگہ انھوں نے بہت سارے لوگ دیکھے۔

"چچا جان، یہ لوگ کیوں جمع ہیں، کیا ہو رہا ہے؟"

"آؤ تمھیں دکھائیں۔ یہ ایک میلا ہے۔" حامد حسین خان نے کہا اور جیپ روک دی۔ جُمن سے کہا کہ وہ سامان اور جیپ کی دیکھ بھال کرے اور یہ تینوں میلا دیکھنے چلے گئے۔

۴

لوگ قریب قریب کے گاؤں سے میلے میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ سبھی خوش تھے۔ گاؤں والوں کے لیے میلا خاص دل چسپی کا موقعہ ہوتا ہے۔ اس میں وہ کچھ تفریح بھی کر لیتے ہیں اور کچھ خریداری بھی! بھڑکیلے رنگوں کے کپڑے پہنے عورتیں، بڑی بڑی پگڑیوں والے مرد سب مِل جُل کر رنگارنگ سماں پیش کر رہے تھے۔ قریب پہنچ کر عابد اور زاہد نے محسوس کیا کہ یہاں تو بڑا شور ہو رہا ہے۔

باجے بج رہے تھے۔ جھولے چل رہے تھے، بچّے چیخ رہے تھے، بھاگ دوڑ رہے تھے۔ کتّے بچے کھچے کھانے پر آپس میں لڑ رہے تھے۔ درختوں کے نیچے فقیر زور زور سے "اللہ کے نام پہ دے جا" کی صدائیں لگا رہے تھے۔

غرض کہ ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ ایک طرف لوگ بندر کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ بندر والا ڈگڈگی بجا کر گلا پھاڑ پھاڑ کر بندر کو نچا رہا تھا۔ لوگ اس تماشے کو دیکھ کر بے تحاشا ہنس رہے تھے۔ بچّے تالیاں بجا رہے تھے۔

"چلو چلیں۔" چچا جان نے کہا، "یہاں تو بڑا شور ہے۔"

زاہد اور عابد کو یہ میلا بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ اور وہ ابھی کچھ دیر اور ٹھیرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ تھوڑی دُور برگد کے گھنے درخت کے نیچے کچھ لوگ جمع ہیں۔

"چچا جان! اُدھر نہ چلیں؟ دیکھیں کیا ہو رہا ہے۔" عابد نے کہا

"چلو۔"

درخت کے نیچے سولر ہیٹ پہنے ایک شخص توتے اور بیا کا تماشا دکھا رہا تھا۔ ان لوگوں کو دیکھتے ہی اس نے دوبارہ تماشا شروع کر دیا۔ ایک پیتل کی کھلونے والی

توپ میں گولا بھر کے اُسے توتے کے آگے رکھ دیا پھر توتے نے اپنی چونچ سے
توپ کا ایک تار کھینچا اور گولا توپ سے نکلا۔ ہلکا سا دھماکا ہوا۔ توتا اپنی جگہ چلا
گیا۔ "دیکھا جناب! یہ توتا توپ چلاتا ہے۔" توتے والے کی زبان بھی چل رہی تھی!
دوسرا تماشا بیا کا تھا۔ اس نے اپنی چونچ میں ایک ایسی لکڑی پکڑی ہوئی تھی، جس
کے دونوں سِروں پر آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ اس کو گول گول گھماتا تو آگ کا دائرہ
سا بن جاتا۔

اس کے بعد یہ لکڑی اس سے لے لی جاتی۔ پھر وہ ایک تیر چلاتا۔ کمان ایک جگہ
لٹکی ہوئی تھی۔ آدمی چڑیا کی چونچ میں تیر دیتا۔ وہ آرام سے تیر کمان پر چڑھاتی
اور کمان کھینچتی۔ تیر دُور جا گرتا۔ اس تماشے پر بھی لوگ زور زور سے تالیاں بجاتے۔
بچّوں کو بھی چڑیوں کا یہ تماشا بہت پسند آیا۔

جب یہ لوگ جیپ میں واپس آئے تو زاہد اور عابد کی زبانوں پر چڑیوں کی تعریف
تھی۔

"یہ بیا تھا نا بھیا!" عابد نے کہا

"ہاں۔ اور اس قدر خوب صورت گھر بناتا ہے کہ کیا بتاؤں۔" زاہد نے کہا

"واقعی۔ بیا کا گھونسلا تو اس کی کاریگری کا بہترین نمونہ ہوتا ہے۔" چچا جان نے کہا۔

"میں نے بھی بیا کا گھونسلا ایک دوست کے ڈرائنگ روم میں سجا دیکھا تھا۔" زاہد
نے بتایا۔

"کتنی حیرت کی بات ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے پرندے اپنے پنجوں اور چونچوں
کی مدد سے اس قدر خوب صورت گھر بناتے ہیں۔" عابد نے کہا

"اللہ کی قدرت ہے کہ اس نے پرندوں کو بھی اتنی عقل دی ہے کہ وہ اپنے بچّوں
کو دشمنوں سے محفوظ رکھ سکیں۔ بیا کا گھونسلا شاخوں سے لٹکتا رہتا ہے۔ بلّی جیسے
جانور اس میں جاکر بچّوں کو ستا نہیں سکتے اور وہ ان سے محفوظ رہتے ہیں۔" زاہد نے کہا۔

"اور یہ بھی کہ گھونسلے میں پرندے کے داخل ہونے کی جگہ اتنی تنگ ہوتی
ہے کہ بیا کے دشمن مشکل ہی سے اس کا راستہ ڈھونڈ پاتے ہیں۔"

"کیا اور بھی پرندے ایسے خوب صورت گھر بنا سکتے ہیں؟" عابد نے پوچھا

"ہاں، کیوں نہیں؟ مثال کے طور پر اوون برڈ مٹی اور کپڑے سے اپنا گھر بناتی
ہے۔ یہ انسان کے سر جتنا بڑا ہوتا ہے۔ گھونسلے کے دو حصّے ہوتے ہیں ایک
حصّے میں چڑیا انڈے دیتی ہے اور دوسرے حصّے میں رہتی ہے۔ دونوں کمروں کے
درمیان ایک چھوٹی سی دیوار بناتی ہے تاکہ انڈے محفوظ رہیں۔" چچا جان نے بتایا۔

پھر یہ لوگ خاصی دیر تک عقل مند چڑیوں کے بارے میں گفت گو کرتے
رہے۔ عابد جس کی چڑیوں کے بارے میں زیادہ معلومات نہ تھی، سوچتا رہا کہ
اب وہ بھی چڑیوں پر کتابیں پڑھے گا۔

گھنٹہ بھر بعد یہ لوگ کھانا کھانے کے لیے رُکے۔ عابد اور زاہد کی امّی نے
ان کے لیے سینڈوچز، پھل اور چائے ساتھ کر دی تھی۔ کھانا کھا کر تھوڑی دیر
یہ لوگ اسی پیڑ کے نیچے بیٹھے رہے، جہاں انھوں نے کھانا کھایا تھا، پھر آگے
چل پڑے۔

۵

تقریباً ساڑھے تین بجے یہ لوگ پہاڑ کے اوپر پہنچ چکے تھے۔ گھنٹہ بھر سے وہ اس پہاڑی راستے پر تھے۔ یہ پہاڑ بھورے رنگ کے تھے اور زیادہ سرسبز بھی نہ تھے۔ عابد اس سفر میں شروع ہی سے بے حد خوش تھا۔ مگر اب وہ کچھ تھک گیا تھا۔ ابھی وہ چچا جان سے کچھ پوچھنا ہی چاہ رہا تھا کہ اچانک جیپ ایک رستے کی طرف مُڑ گئی۔

گھنے درختوں سے ڈھکا ہوا یہ راستہ ناہموار تھا اس لیے جیپ اُچھلتی ہوئی جا رہی تھی۔ بیس منٹ کے بعد جیپ ایک صاف ستھرے سے ہموار علاقے میں ایک چھوٹے سے گھر کے سامنے جا کر رُک گئی۔ سُرخ ٹائلوں کی چھت اور لمبی لمبی کھڑکیوں والا یہ خوب صورت گھر بچّوں کو بہت ہی پیارا لگا۔

"کتنا خوب صورت گھر ہے!" عابد اور زاہد خوشی سے چلّائے۔

سرسبز درختوں کے بیچ میں سرخ چھت اور گلابی دروازوں والا گھر ایسا لگ رہا تھا جیسے پھول۔ چچا جان نے جیپ پورچ میں کھڑی کی۔ انھیں خوشی ہوئی کہ بچّوں کو اُن کا گھر پسند آیا۔ انھوں نے حال ہی میں یہ گھر ایک ریٹائرڈ آرمی آفیسر سے لیا تھا۔ تھوڑی بہت تبدیلیوں کے بعد یہ ایک خوب صورت مکان بن گیا تھا۔

"میرا خیال ہے تمھیں یہ گھر کچھ چھوٹا لگے گا۔" چچا جان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پھر انھوں نے اس کے چاروں کمرے دکھاتے ہوئے کہا، "بس یہی کچھ ہے۔"

ایک کمرے کا دروازہ کھول کر وہ عابد اور زاہد سے بولے: "بھئی بچّو! یہ تم لوگوں کا کمرا ہے۔"

ان دونوں کو اپنا کمرا بہت پسند آیا۔ یہ چچا جان کے کمرے کے برابر تھا اور

اس میں ایک لمبی کھڑکی تھی جس سے دُور تک کا منظر نظر آ رہا تھا۔ برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں اور درخت خوب صورت منظر پیش کر رہے تھے۔

بچّوں نے اپنا سامان جیپ سے اتارا۔ یہ دونوں اپنا کام خود کرتے تھے۔ ملازم کے ہونے کے باوجود اپنے کمرے کو صاف رکھنا، کپڑے استری کرنا اور جوتوں پر پالش کرنا انھی کی ذمّے داری تھی۔

انھوں نے بستر کھول کر پلنگوں پر بچھا دیے اور سوٹ کیس قرینے سے دیوار کے ساتھ رکھ دیا۔ عابد نے کہا کہ وہ نہائے گا۔ جمّن نے کہا، "چھوٹے صاحب! جلدی سے نہا لیجیے گا۔ چائے منٹوں میں تیار ہوتی ہے۔"

عابد نہانے کے لیے غسل خانے میں گھُس گیا اور زاہد چچا جان کے باغ کی طرف نکل گیا۔ یہاں طرح طرح کے پھول لگے تھے اور ان میں سے بیشتر سے وہ واقف تھا۔ گلاب، چنبیلی، موتیا، سورج مکھی اور للی قرینوں سے کیاریوں میں لگے تھے۔ بوگن ویلا کی بیل دروازے کے ساتھ ساتھ اوپر تک پھیلی ہوئی تھی۔ لگتا تھا اس پر بڑی محنت کی جاتی ہے۔ لان کے دوسری طرف زینیا اور ڈاہلیا کے خوب صورت پھول لگے ہوئے تھے۔ سُرخ، نارنجی اور زرد پھول سبز پتّوں پر بڑے بھلے لگ رہے تھے۔

لان سے نکل کر وہ باہر آ گیا۔ یہاں بے شمار درخت تھے۔ اچانک وہ ٹھٹک گیا۔ درخت کے پیچھے کوئی تھا۔ کوئی جانور۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اسے ایک سر نظر آیا۔ اس پر سینگ نہ تھے۔ پھر اسے ایک چہرہ دکھائی دیا! شکر ہے یہ کوئی لڑکا تھا۔

"کون ہے؟" زاہد نے پوچھا۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر ایک آواز آئی، "میں ہوں۔" اور ایک لڑکا اسی کی عمر کا درخت کے پیچھے سے اس کے سامنے آ گیا۔ زاہد کو یہ اچھا لڑکا لگا۔

"کیا نام ہے تمھارا؟" زاہد نے پوچھا۔

"شبیّر، اور تمھارا؟"

"زاہد۔"
"تم ابھی آئے ہو؟"
"ہاں، میں ابھی آیا ہوں۔ اور تم کہاں رہتے ہو؟" زاہد نے پوچھا۔
"میں یہاں ہی رہتا ہوں۔ وہ سامنے درختوں کے پیچھے!" پھر بشیر نے پوچھا کہ کیا وہ حامد صاحب کا بیٹا ہے۔
"نہیں، میں ان کا بھتیجا ہوں۔ میرا چھوٹا بھائی بھی میرے ساتھ آیا ہے ہم یہاں چھٹیاں گزارنے آئے ہیں۔"
اس سے پہلے کہ شبیر کچھ کہتا عابد آگیا۔
"چائے تیار ہے۔" عابد نے آتے ہی کہا۔
"کل پھر آنا۔" زاہد نے اندر جاتے ہوئے اس لڑکے سے کہا۔ پھر اس نے عابد کو شبیر سے ملاقات کا حال سُنایا۔

٦

اگلی صبح وہ ناشتے کی میز پر آئے ہی تھے کہ ایک قاصد آیا، وہ چوہدری زمان کا خط لایا تھا۔ چوہدری صاحب ڈسٹرکٹ فاریسٹ آفیسر تھے اور وہ فوری طور پر حامد حسین خان سے ملنا چاہتے تھے۔
حامد حسین خان نے اسی کے ہاتھ جواب بھجوایا کہ میں تھوڑی دیر میں حاضر ہوتا ہوں۔
"مجھے ناشتے کے فوراً بعد ہی ہیڈ آفس جانا ہوگا۔" چچا جان نے کہا۔
"کیا بات ہے چچا جان؟"
"معلوم نہیں۔"
"ہو سکتا ہے یہ جنگلوں میں بلا اجازت شکار کا مسئلہ ہو۔ ناجائز شکار ہی یہاں کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔" زاہد نے رائے دی۔
"ہاں بیٹے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے مسائل ہوتے ہیں۔ کبھی اِسٹاف کا مسئلہ ہوتا ہے، کبھی درخت لگوانے کا مسئلہ ہوتا ہے۔ ایک ملاقات میں کئی مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔" چچا جان نے کہا۔
ناشتے کے بعد زاہد نے پوچھا، "آپ کب تک واپس آجائیں گے؟"
"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ مگر میرا خیال ہے شام ہو جائے گی۔"
یہ بات وہ اپنے تجربے سے کہہ رہے تھے، اس لیے کہ ہیڈ آفس جا کر وہ کبھی بھی جلد واپس نہ آپائے تھے۔
چند منٹوں میں چچا جان تیار ہو گئے۔ اور جیپ میں بیٹھنے سے پہلے انھوں نے جمّن کو ہدایت دی کہ وہ بچوں کو ٹھیک سے کھانا کھلا دے۔ ٹامی بھی کود کر جیپ

میں بیٹھ گیا۔ ان کے جانے کے بعد زاہد اور عابد باغ میں ٹہلتے ہوئے سوچنے لگے کہ آج کا دن کیسے گزارا جائے۔ وہ گھر میں بھی رہنا نہیں چاہتے تھے اور جنگل کی طرف جانا بھی خطرناک تھا۔ چیتے کے بارے میں تو وہ پہلے ہی سُن چکے تھے۔

"اللہ کرے شبیر آ جائے۔ اسے تو یہاں کی سب جگہوں کا پتا ہوگا۔" عابد نے کہا۔

"ہم اس کے گھر بھی تو نہیں جا سکتے۔ کیا پتا وہ کہاں رہتا ہے؟" زاہد نے جواب دیا۔

عابد کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ "چلو سامنے حویلی میں چلتے ہیں۔ لگتا ہے یہ خاصی قریب ہے۔"

زاہد نے مُڑ کر دیکھا۔ تھوڑے فاصلے پر ایک زرد حویلی تھی

"خیال تو اچھا ہے۔" زاہد نے تائید کی۔ "چلو۔"

"ٹھیرو۔ میں اپنی دُوربین بھی لے لوں۔"

"اور میں اپنی شاٹ گن۔"

وہ گھر کے اندر گئے تاکہ جمّن کو بتائیں کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ مگر جمّن نظر نہ آیا۔

"چھوڑو چلتے ہیں۔ ہم کون سا دیر میں آئیں گے؟"

۷

گھر کی مشرقی سمت ایک چوڑی سی بل کھاتی پگ ڈنڈی تھی۔ یہ دونوں اُسی پر ہو لیے۔ اس جگہ درخت زیادہ گھنے نہ تھے۔ زمین پر گھاس اُگی ہوئی تھی اور درختوں کے سوکھے زرد پتے بکھرے پڑے تھے۔ کناروں پر چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تھیں۔ سوائے چڑیوں کے انھیں کوئی بھی جان دار نظر نہیں آیا۔ ایک بھرے بالوں والے مرغے کو دیکھ کر عابد نے نشانہ لیا، مگر اس کا نشانہ چُوک گیا۔ مرغا غائب ہوگیا۔

"شکر ہے! تمھارا نشانہ خطا ہوگیا۔ ورنہ ہم بھی غیر قانونی شکار کے جرم میں دھر لیے جاتے۔" زاہد نے کہا۔

"ارے ہاں، یہ تو واقعی غلط ہوتا۔"

ایک دوسرے پر جُملے کستے ہنستے ہنساتے وہ لوگ وہاں پہنچے جہاں سے یہ پگ ڈنڈی دو حصّوں میں بٹ گئی تھی۔ سیدھے ہاتھ کا راستہ حویلی کو جاتا تھا اور اُلٹے ہاتھ کا راستہ غالباً گاؤں کو۔ یہ لوگ حویلی والے راستے پر چل دیے۔ اب جنگل گھنا ہو رہا تھا۔ دونوں طرف اونچے اونچے درخت تھے۔

"کیا ہم صحیح راستے پر ہیں؟" عابد نے کچھ فکر مند ہو کر کہا۔

"چلو اس آدمی سے پوچھیں؟"

"آدمی؟ کون آدمی؟"

زاہد نے ایک آدمی کی طرف اشارہ کیا جو ایک درخت کے نیچے گیروے کپڑے پہنے کھڑا تھا۔ وہ بالکل چُپ چاپ کھڑا تھا۔ جیسے ہی یہ لوگ اس کے قریب پہنچے وہ مُڑا۔ اور ایک کھلی کتاب جو اس کے ہاتھ میں تھی بند کر دی۔ یہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا، جس نے سنہری فریم کی عینک لگائی ہوئی تھی۔ اس

کا سر مُنڈا ہوا تھا۔

"جناب! کیا یہ راستہ حویلی کو جاتا ہے؟" زاہد نے ادب سے پوچھا۔ گیروے لباس والے نے ایک دَم سے جواب نہیں دیا۔ چند لمحوں تک وہ انھیں دیکھتا رہا۔ پھر بہت ہی ملائم لہجے میں کہنے لگا:

"تمھارا مطلب ہے وہ پرانی کھنڈر حویلی؟"

"کھنڈر حویلی؟ ہمیں پتا نہیں کہ یہ حویلی کھنڈر ہے۔"

"کھنڈر اور ویران ہی نہیں، بلکہ آسیب زدہ بھی ہے۔"

"آسیب زدہ!" عابد نے حیرت سے کہا، "آپ کا مطلب ہے کہ یہاں کوئی بھوت رہتا ہے۔"

"ایک بھوت نہیں، یہاں دو بھوت رہتے ہیں۔" اس نے اسی نرم لہجے میں کہا، "مگر یہ تو بتاؤ تم لوگوں کو حویلی میں جانے کا مشورہ کس نے دیا ہے؟"

"کسی نے بھی نہیں۔" زاہد نے کہا۔ "یہ تو ہمارا اپنا خیال تھا کہ حویلی دیکھیں۔"

"مجھے تو لگتا ہے تم لوگ یہاں نئے آئے ہو!" اس نے سر ہلا کر کہا۔

"جی ہاں! ہم تو کل ہی یہاں پہنچے ہیں۔ حامد حسین خان صاحب ہمارے چچا ہیں۔ ہم ان کے ساتھ آئے ہیں۔"

"تم حامد حسین خان کے بھتیجے ہو۔" وہ آدمی کچھ فکر مند سا ہو کر بولا۔ پھر اس نے اسی ہمدردانہ لہجے میں کہا، "میرے بچّو! اس حویلی کی طرف جانے کا سوچنا بھی مت۔"

"مگر ہم تو بھوتوں پر یقین نہیں رکھتے۔" زاہد نے اعتماد سے کہا۔

"میں بھی نہیں رکھتا تھا۔ مگر جب کوئی اپنی آنکھوں سے بھوت دیکھ لے تو پھر یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" عابد اور زاہد ایک ساتھ بولے، "کیا آپ نے اپنی آنکھوں سے بھوت دیکھے ہیں؟"

"ہاں۔"

زاہد اور عابد نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"میں دیکھ رہا ہوں شاید تم میری بات پر یقین نہیں کر رہے۔ خیر، چلو میں تمھیں پورا قصّہ سُناتا ہوں۔"

وہ ایک کٹے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھ گیا۔ یہ دونوں بھی اس کے برابر بیٹھ گئے۔

"ایک سال قبل جب میں یہاں آیا تھا تو تب ہی مجھے بھوت نظر آ گئے تھے۔ میں شہر کے ہنگاموں سے اُکتا چکا تھا اور پُرسکون زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ چناں چہ میں نے اپنے بچپن کے ساتھی عبید کے پاس کچھ دن گزارنے کا فیصلہ کیا۔ عبید فاریسٹ آفیسر تھا۔ وہ یہاں برسوں سے رہ رہا تھا۔" وہ کہتے کہتے رُکا اور پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا، "تم جانتے ہو جوگ لینا کسے کہتے ہیں؟"

"نہیں۔"

"دیکھو! انسان کی زندگی کے تین دَور ہیں۔ بچپن، جوانی اور بڑھاپا۔ جو لوگ زندگی کے پہلے دَو دَور بہت اچھے گزارتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو بڑھاپے میں ایسی توفیق دیتے ہیں کہ وہ دنیا کو چھوڑ کر سب سے الگ ہو جاتے ہیں۔ یعنی گیروے کپڑے پہن کر ہر وقت عبادت میں لگے رہتے ہیں، ایسے ہی لوگ جوگی یا درویش کہلاتے ہیں۔ چناں چہ میں نے بھی اپنی زندگی کے باقی دن عبادت میں گزارنے کا تہیہ کر لیا ہے اور اسی وجہ سے میں گیروے کپڑے پہنے یہاں جنگل میں رہ رہا ہوں۔"

اس نے چند لمحوں کو اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ساکت بیٹھ گیا۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں اور کہنا شروع کیا، "تم سوچ رہے ہو گے کہ میں اپنی کہانی کیوں سُنا رہا ہوں۔ اس لیے کہ یہاں آنے کے بعد میں نے سوچا کہ اس حویلی میں جا کر عبادت کرنی چاہیے۔ عبید نے مجھے منع کیا اور کہا کہ اس حویلی میں بھوت ہیں۔ مگر میں نے یقین نہیں کیا۔ ہم اسی شام پہاڑی ندی کے کنارے کنارے جا رہے تھے۔ یہ ندی حویلی سے کچھ ہی فاصلے پر ہے۔ مگر تم ندی کی طرف سے حویلی تک نہیں پہنچ

سکتے۔ تمھیں کوئی تیس قدم تک جھاڑیوں سے گزرنا ہوگا تب تمھیں پگ ڈنڈی ملے گی۔"

"کیا یہ پگ ڈنڈی ندی سے حویلی تک جاتی ہے؟"

"ہاں، اصل میں اس وقت تم دو راستوں کے بیچ کھڑے ہو یہاں سے تم حویلی کو دیکھ سکتے ہو۔"

"پھر وہ بھوت آپ کو کہاں ملے؟" عابد کو بھوت والی کہانی سے زیادہ دل چسپی تھی۔

وہ مسکرایا اور بولا، "ہاں میں وہی بتا رہا ہوں۔ میں اور عبید اس شام ندی کے کنارے بیٹھے مچھلیاں پکڑ رہے تھے مگر قسمت ہمارے ساتھ نہ تھی۔ ہم نے ایک بھی مچھلی نہ پکڑی۔ آخر کار میں نے عبید سے کہا، "رات ہونے والی ہے، چلو چلیں۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور آہستہ سے کہا کہ اُس نے حویلی میں کوئی شکاری دیکھا ہے۔"

"عبید کو کیسے معلوم ہوا کہ حویلی میں شکاری ہے؟" زاہد نے اس کی بات کاٹی۔

"اللہ جانے، ہو سکتا ہے اس کے ذہن میں یہی ہو۔ چناں میں نے گردن موڑ کر دیکھا تو حویلی میں ایک شخص سفید کپڑے پہنے کھڑا تھا۔"

"مگر کوئی شکاری اس طرح سفید کپڑے پہنے رات کو گھوم نہیں سکتا۔ اس طرح تو وہ فوراً پکڑا جائے گا۔" زاہد نے کہا۔

"ٹھیک، بالکل ٹھیک۔ مگر اس وقت یہ بات ہماری سمجھ میں نہ آئی۔ میں ابھی جا کر اسے ٹھیک کرتا ہوں؛ عبید نے کہا اور حویلی کی طرف چل پڑا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ حیرت کی بات یہ ہوئی کہ وہ ہم کو دیکھ کر نہ بھاگا اور نہ خوف زدہ ہوا۔ ہو سکتا ہے اس نے ہمیں نہ دیکھا ہو۔ مگر ہم تو اسے دیکھ رہے تھے۔ ادھیڑ عمر کا ایک شخص سفید براق شلوار قمیص پہنے کھڑا تھا۔"

"شکاری اور شلوار قمیص میں! عجیب بات ہے!" زاہد نے کہا۔

"بالکل ٹھیک،" گیروے لباس والے آدمی نے کہا۔ "میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں

کہ اُس وقت یہ باتیں ہماری سمجھ میں نہ آئیں۔ جب ہم اس کے قریب پہنچے تو بھی وہ ایسے ہی کھڑا رہا۔ میں نے دل میں کہا، آج تو ایک شکاری پکڑا گیا، مگر دوسرے ہی لمحے وہ شخص غائب ہو گیا۔ ہم حیران رہ گئے۔ خوف سے ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یقیناً وہ بھوت تھا۔ ہم خوف زدہ ہو کر واپس جانے کے لیے مُڑے تو پتا ہے ہم نے کیا دیکھا؟"

"کیا؟" زاہد نے بے چینی سے پوچھا۔

"ہم سے بہ مشکل پانچ گز کے فاصلے پر دو آدمی کھڑے تھے۔ بالکل ایک جیسے۔ ایک سا لباس پہنے۔ انھوں نے ہمارا راستہ روک رکھا تھا۔ گھبراہٹ کے عالم میں میں نے ایک پتھر اُٹھا کر ایک آدمی کے مارا۔ جانتے ہو کیا ہوا؟ پتھر ان کے درمیان سے گزر گیا۔"

"درمیان سے گزر گیا۔" عابد اُچھل پڑا۔

"ہاں تمھیں پتا نہیں، بھوتوں کے جسم نہیں ہوتے۔ ان پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا، نہ ڈنڈوں کا، نہ پتھروں کا اور نہ گولیوں کا۔ وہ آدمی نہیں تھے دو بھوت تھے۔"

"پھر کیا ہوا؟" عابد اب اندر ہی اندر ڈر سے کانپ رہا تھا۔

"بھوت کو میرے پتھر مارنے سے غصہ آ گیا۔ اس نے ہمیں حویلی میں جانے کو کہا۔ خوف سے میں کانپ رہا تھا۔ شاید بھوت ہماری جان لینا چاہتے تھے۔ اور ہمیں بھی شاید بھوت بنانا چاہتے تھے۔"

"پھر آپ کی جان کیسے بچی؟" زاہد نے پوچھا

"اللہ کا شکر ہے کہ عبید کو یاد آ گیا کہ ایسے موقعوں پر آیۃ الکرسی پڑھنی چاہیے۔ اس نے جلدی جلدی آیۃ الکرسی پڑھنی شروع کر دی اور بھوت بھاگ گئے۔ لگتا ہے عبید نے کوئی نیکی کی تھی جس کے صلے میں ہم لوگوں کی جان بچ گئی۔ اگر اسے آیۃ الکرسی یاد نہ آتی تو میں اس وقت تمھیں یہ کہانی سُنانے کے لیے زندہ نہ ہوتا۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر وہ گیروے لباس والا شخص اُٹھ کھڑا ہوا۔

"میں اب چلتا ہوں۔ مگر یاد رکھنا! حویلی سے دُور رہنا۔"

عابد بھوتوں کی کہانی سے بہت متاثر ہوا تھا۔ مگر زاہد کو اب بھی شک تھا۔ اسے اس طرح بھوتوں کے جسم میں سے پتھر کے پار ہو جانے پر یقین نہ آیا تھا۔ اُس نے کہا، "میرے خیال میں تو کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو نظر آتی ہو اور جسم نہ رکھتی ہو۔"

عابد مسکرایا مگر کچھ بولا نہیں۔

"میرے خیال میں تو ہمیں خود حویلی میں جا کر دیکھنا چاہیے کہ اس کہانی میں کتنی سچائی ہے؟"

"نہیں آج نہیں۔" عابد جلدی سے بولا۔ اور بھائی کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ وہ خوف زدہ نہیں ہے کہنے لگا، "کھنڈروں میں اس طرح جانا ٹھیک نہیں ہے۔ شاید چچا جان کو بھی ہمارا وہاں جانا پسند نہ آئے۔"

"مجھے یقین ہے ان کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔" زاہد نے کہا۔

مگر عابد راضی نہ ہوا اور وہ لوگ اس راستے کی طرف مُڑ گئے جو گاؤں کو جاتا تھا۔

"چلو گاؤں کی طرف۔ شاید شبیر مل جائے۔"

"ہاں! اُسے ہمیں وہاں دیکھ کر بہت حیرت ہوگی۔"

۸

عابد اور زاہد اس پگ ڈنڈی پر چل دیے جو گیروے کپڑوں والے نے بتائی تھی کہ گاؤں کو جاتی ہے۔ وہ چلتے رہے چلتے رہے یہاں تک کہ یہ راستہ گھنے جنگل کی طرف مُڑ گیا۔ کچھ جگہوں پر تو اتنی لمبی لمبی گھاس اُگی ہوئی تھی کہ انھیں بہ مشکل اس سے نکلنا پڑا۔

فضا میں جنگلی پھولوں کی خوش بُو بسی ہوئی تھی، راستہ بھی خاصا ناہموار تھا۔ ایک مرتبہ تو ان کے سامنے سے ایک بڑا سانپ نکل کر گیا جس سے یہ دونوں ٹھٹک سے گئے۔

"معلوم ہوتا ہے گاؤں والے اس راستے سے زیادہ آتے جاتے نہیں ہیں۔" زاہد نے کہا۔

"میرے خیال میں تو ہمیں واپس چلنا چاہیے۔" عابد نے کہا۔ بھوت کی کہانی سُن کر وہ خوف زدہ تھا۔

مگر زاہد ابھی گھر واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر یہ راستہ جاتا کہاں ہے؟ یقیناً یہ اگر گاؤں کو بھی نہ جاتا ہوگا تو کہیں نہ کہیں پہنچا دے گا۔

مجبوراً عابد کو بھی اس کے ساتھ چلنا پڑا۔ راستہ اب خاصا تنگ ہو گیا تھا۔ کہیں کہیں پگ ڈنڈی غائب ہو جاتی اور کہیں کہیں دوبارہ نظر آنے لگتی۔ تھوڑی دُور اور چلنے کے بعد انھیں پانی کے بہنے کی آواز آنے لگی۔

"اللہ جانے ہم کہاں جا رہے ہیں؟" عابد نے کہا، "کیا تمھیں یقین ہے کہ ہم ندی کی طرف نہیں جا رہے؟" اسے یہ خطرہ تھا کہ کہیں یہ راستہ انھیں سیدھا بھوتوں والی حویلی تک نہ لے جائے۔

"نہیں، میرا خیال ہے یہ کسی پہاڑی چشمے کی آواز ہے۔ آؤ اور آگے چل کر دیکھیں۔" زاہد نے جواب دیا۔

وہ دونوں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے، سانپوں اور بچھوؤں سے بچتے ہوئے آگے بڑھے۔ پندرہ منٹ میں وہ ایک وادی میں پہنچ گئے۔ یہ اس قدر خوب صورت وادی تھی کہ وہ حیران رہ گئے۔ یہ جگہ زمین کا ایک مستطیل صاف ستھرا ہرا بھرا ٹکڑا تھی۔ سامنے اور پیچھے کی طرف لمبے لمبے درختوں کی قطاریں تھیں۔ سیدھے ہاتھ کی طرف پہاڑی سے ایک چھوٹا سا چشمہ بہ کر آ رہا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ مختلف رنگوں کے چھوٹے بڑے گھر بنے ہوئے تھے۔ دور سے ایسا لگتا تھا جیسے یہ کھلونوں کے مکان ہوں۔ اُلٹے ہاتھ کی طرف سرسبز گھاس اور چھوٹے چھوٹے پودے نظر آ رہے تھے۔

"لگتا ہے یہ قطعہ یہاں کے لوگوں نے بنایا ہے۔" زاہد نے کہا۔ "تم نے دیکھا کہ یہاں سے درخت کاٹ کر زمین کو صاف ستھرا کیا گیا ہے۔"

"ہاں، وہ دیکھو اس درخت کے نیچے کی گھاس بھی کٹی ہوئی ہے۔" عابد نے کہا۔

یہاں درخت خاصے اونچے تھے۔ ان کی لمبی لمبی پھیلی ہوئی شاخیں ایک دوسرے سے ملی ملی تھیں۔ ایک بڑے سے درخت کے قریب پہنچ کر زاہد نے، "دیکھو! اس درخت کی چھال چھلی ہوئی ہے۔ غالباً کسی نے اسے صاف کیا ہے۔"

"نہیں، میرے خیال میں تو یہ پنجوں کے نشان ہیں۔ تمھیں تو پتا ہے چیتے درخت پر بھی چڑھ سکتے ہیں۔" عابد نے کہا۔

زاہد نے حیرت سے عابد کی طرف دیکھا، "چھوڑو، چھوڑو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ چیتا..." ابھی الفاظ اس کے مُنھ میں ہی تھے کہ درخت کے اوپر سے چیتے کی خوف ناک آواز آئی۔ خوف سے دونوں بھائی پیلے پڑ گئے۔ چیتا درخت پر تھا!! دونوں نے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا۔ ان کے خیال میں ان کی شاٹ گن چیتے کے لیے بالکل ناکافی تھی۔

اگلے ہی لمحے، انھیں درخت کی ایک شاخ پر کسی آدمی کی ٹانگ نظر آئی اور پھر کسی کے ہنسنے کی آواز آئی۔ "ہا ہا ہا! ہو ہو..."

"کون ہو تم؟" زاہد نے زور سے کہا اور اس کو مارنے کے لیے آگے بڑھا۔

"ٹھیرو۔" عابد چیخا۔ "یہ شبیّر ہے۔"

یہ شبیّر ہی تھا۔ اس نے اوپر سے ہی ہنستے ہوئے کہا، "کیا ہوا؟ ڈر گئے؟" اور اب اس کی ہنسی میں عابد اور زاہد بھی شامل ہو گئے۔

"تمھاری آواز نے تو واقعی ہمیں ڈرا دیا تھا۔ کس قدر مہارت سے تم نے چیتے کی آواز نکالی۔" عابد نے کہا۔

شبیّر نے بات بدلتے ہوئے کہا، "تم یہاں کیسے آ گئے؟"

"بس ہم نے سوچا، ذرا سی سیر کر لی جائے، ٹہلتے ٹہلتے یہاں تک پہنچ گئے۔" زاہد نے کہا۔ اس نے گیروے کپڑوں والے کے بارے میں بتانا کچھ مناسب نہ سمجھا۔

"مگر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں تو اکثر صبح کو یہاں آتا ہوں۔" شبیّر نے کہا۔

"ہاں یہ جگہ تو واقعی بہت پیاری ہے۔" عابد نے کہا۔

"میں تو اکثر دوپہر کو یہاں سو بھی جاتا ہوں۔" شبیّر نے کہا۔

عابد اور زاہد حیرانگی سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ درختوں کی شاخوں پر یہ کیسے سوجاتا ہوگا؟ ایک کروٹ میں ہی نیچے گرنے کا خطرہ ہے۔

"آؤ، تمھیں دکھاؤں میں کیسے سوتا ہوں۔" اور شبیّر نے درخت پر چڑھنا شروع کر دیا۔ یہ دونوں بھی پیچھے پیچھے چڑھے۔ بستر بچھا تھا۔ دو بڑی بڑی شاخوں کو ملا کر اس پر ایک بڑا سا مچان بنایا گیا تھا جس پر کینوس بچھا تھا۔ اوپر بھی ایک کینوس بندھا ہوا تھا۔

"اوپر والا کینوس مجھے بارش سے بچاتا ہے۔" شبیّر نے کہا۔

دونوں بچّوں کو یہ جگہ بہت ہی پسند آئی۔ شبیّر نے اپنے دوستوں کو بڑے فخر سے اس پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ ان لوگوں کے بیٹھتے ہی مچان ایک زوردار چٹاخ

کی آواز سے ٹوٹ گیا۔ اگر یہ لوگ فوراً ہی شاخوں کو نہ پکڑ لیتے تو دھڑام سے زمین پر گر پڑتے۔

شبیر شرمندہ ہوگیا۔ تینوں نیچے اُتر آئے۔ زاہد نے کہا:

"کوئی بات نہیں، ہم تینوں مِل کر دوبارہ مچان بنا لیتے ہیں۔"

تینوں نے درختوں کی شاخیں توڑنا شروع کر دیں اور آدھ گھنٹے ہی میں انھوں نے آدھی درجن شاخیں کاٹ کر اُن کی پتیوں اور چھوٹی چھوٹی ڈنڈیوں کو صاف کر دیا پھر ان شاخوں کو اوپر لے جا کر رسّی سے مضبوطی سے باندھ دیا۔ پھر اس پر کپڑا بِچھا دیا۔ اب تینوں اس پر بیٹھے۔ شکر ہے اب مچان نہیں ٹوٹا۔ تینوں کو ان کی محنت کا پھل مِل گیا تھا، یعنی ایک مضبوط مچان جس پر تینوں بیٹھ سکتے تھے۔

اس مچان سے دُور دُور کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ سیدھے ہاتھ کی طرف وہی حویلی تھی جس کے بارے میں انھوں نے سُنا تھا کہ آسیب زدہ ہے۔ حویلی کا سامنے کا حصّہ خاصا ٹوٹا پھوٹا تھا اور اس پر کائی جمی تھی۔ دروازے بھی جو پُرانی وضع کے تھے سیاہ پڑ چکے تھے۔

"کیا اس حویلی میں بھوت ہیں؟" عابد نے پوچھا۔

"ہاں، اِدھر کوئی بھی نہیں جاتا۔ لوگ کہتے ہیں اس میں کوئی بھوت ہے۔ ایک شخص یہاں قتل ہوا تھا۔ اس کی روح اب بھی اس میں بھٹکتی ہے۔" شبیّر نے کہا۔

"نہیں، اس میں ایک بھوت نہیں ہے بلکہ دو بھوت ہیں۔" عابد نے کہا۔ پھر اس نے وہ ساری کہانی شبیّر کو سنائی جو اس نے صبح سُنی تھی۔

"ہو سکتا ہے، دو ہی ہوں۔ مگر کوئی حویلی کی طرف جاتا نہیں ہے۔" شبیّر نے کہا۔

اچانک زاہد کی نظر اپنی گھڑی پر پڑی۔ "ارے۔ بارہ بج گئے، چلو گھر چلیں۔"

شبیّر نے ایک چھوٹا سا ناشتے دان ایک شاخ سے اُتارتے ہوئے کہا، "آؤ پہلے کھانا کھا لیں۔ میں تو اکثر گھر سے کھانا لے آتا ہوں اور شام تک یہیں رہتا ہوں۔"

ناشتے دان میں تین پراٹھے اور قیمہ تھا۔ عابد اور زاہد ضرور کھا لیتے مگر یہ کھانا ان تینوں کے لیے ناکافی تھا۔ اس سے کسی کا بھی پیٹ نہ بھرتا۔

"کوئی بات نہیں شبیّر، ہم لوگ گھنٹہ بھر میں کھانا کھا کر آتے ہیں۔ تم تب تک یہیں رہو۔" زاہد نے کہا۔

"مگر تم اپنی یہ 'جادوئی آنکھ' تو مجھے دیتے جاؤ۔"

"جادوئی آنکھ۔"

"ہاں، یہ دوربین۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"لو۔"

"شکریہ! میں یہاں سے دُور دُور کے مناظر دیکھتا رہوں گا۔"

۹

گھنٹہ بھر میں دونوں بھائی، شبیر کے پاس واپس آ گئے۔ درخت پر چڑھ کر انھوں نے دیکھا، شبیر دُوربین سے حویلی کی طرف دیکھ رہا ہے۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" زاہد نے پوچھا، مگر شبیر کے جواب دینے سے پہلے عابد بول اُٹھا، "بھائی، دیکھو حویلی میں سے کوئی شخص باہر آ رہا ہے۔"

مچان سے حویلی بہت زیادہ دُور نہ تھی اور بغیر دوربین کے بھی صاف نظر آ رہا تھا کہ کوئی حویلی سے نِکلا ہے۔

"یہ دوسرا شخص ہے، جو حویلی سے باہر آیا ہے، تھوڑی دیر پہلے ایک اور شخص حویلی سے باہر نکل چکا ہے۔" شبیر نے بتایا۔

پھر اس نے بتایا کہ جب یہ دونوں بھائی چلے گئے تو اس نے دُوربین سے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ جنگل کی طرف سے دو آدمی آئے انھوں نے حویلی کے قریب رُک کر پراسرار انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر حویلی میں چلے گئے۔ ایک کے ہاتھ میں بندوق تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں ایک بڑا سا تھیلا تھا۔

"یہ اجنبی ہوں گے، انھیں پتا نہیں ہو گا کہ حویلی میں بھوت ہیں۔" زاہد نے کہا۔

"مگر یہ شخص تو بالکل اجنبی نہیں لگتا۔" زاہد نے شبیر کے ہاتھ سے دُوربین لے لی اور آدمی کا حلیہ بتانا شروع کیا: "درمیانہ قد، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، داڑھی بڑھی ہوئی۔ پینٹ شرٹ پہنے ہوئے۔ اس آدمی کے تھیلے سے کوئی چیز گری۔ مگر اسے پتا نہیں چلا۔ شاید یہ کسی دھات کی بنی ہوئی تھی اس لیے کہ سورج کی شعاعوں سے چمک رہی تھی۔ زاہد نے یہ بات بھی ان دونوں کو بتائی۔

"تمھیں یقین ہے کہ تھیلے میں سے کچھ گرا ہے؟"

"بالکل، سو فی صد!"

"چلو، ہم چل کر دیکھیں۔ شبیر! یہ حویلی یہاں سے کتنی دُور ہو گی؟"

"اگر ہم شارٹ کٹ جائیں تو صرف آدھا کلو میٹر۔"

"چلو، پھر فوراً چل پڑو۔"

آگے آگے شبیر اور پیچھے پیچھے یہ دونوں بھائی حویلی کی طرف چل پڑے۔ راستے میں انھیں کئی چھوٹے بڑے پہاڑی چشمے ملے۔

"یہ چشمے پہاڑی ندی سے مل جاتے ہیں۔" شبیر نے بتایا۔

"مگر ندی کہاں ہے؟ نظر تو نہیں آ رہی؟" زاہد نے کہا۔

"یہاں گھنی گھاس اور سبزیاں اُگی ہوئی ہیں۔ اس لیے دُور تک تم دیکھ نہیں سکتے۔" آخر ایک پہاڑی پر چڑھتے ہوئے انھیں ندی نظر آ ہی گئی۔ دُور سے اس کا صاف شفاف پانی، چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔

چلتے چلتے وہ لوگ ایک گہرے بھورے رنگ کے میدان میں پہنچے اس میدان کے بیچوں بیچ یہ حویلی تھی۔

"تم نے وہ چیز کہاں گرتے دیکھی تھی؟" شبیر نے پوچھا۔

"وہ دیکھو، اس طرف۔ شاید اس آدمی کو ٹھوکر لگی تھی۔" زاہد نے کہا۔

یہ تینوں تیزی سے اُدھر پہنچے۔ اچھی طرح گھوم پھر کر تلاش کیا، مگر کوئی چیز نہ ملی۔

"ہو سکتا ہے تمھیں غلط فہمی ہوئی ہو۔" عابد نے کہا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس شخص کو پتا چل گیا ہو کہ کوئی چیز گری ہے اور اس نے آ کر اُٹھا لی ہو۔" زاہد نے کہا۔

اس جگہ پر قدموں کے نشان ایسے گڈمڈ تھے کہ ان کو کوئی بات صحیح طور پر سمجھ میں نہ آئی۔

"اب کیا کرنا چاہیے؟" عابد نے کہا۔

"چلو حویلی کے اندر چلیں۔" زاہد نے رائے دی۔

عابد کا ڈر تو اسی وقت ختم ہوگیا تھا جب اُس نے ایک آدمی کو زندہ سلامت حویلی سے باہر آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ فوراً ہی حویلی میں جانے کو راضی ہوگیا۔

یہ ایک خاصی بڑی حویلی تھی۔ درمیان میں ایک بہت بڑا سا ہال تھا اور اس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ عمارت کافی ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ درمیان کا بڑا ہال اور کمرے تو سلامت تھے مگر سامنے کا بڑا حصّہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا، دیواروں سے پلاسٹر اُکھڑ چکا تھا۔ حویلی کے دو دروازے تھے، سامنے والا دروازہ بڑا تھا۔ اس میں لگے ہوئے لوہے کے کنڈے زنگ آلود تھے، ایک دروازہ پچھلی طرف تھا۔ حویلی میں صرف انھی دو دروازوں سے داخل ہوا جاسکتا تھا۔ چھوٹے کمروں سے کوئی دروازہ باہر نہیں کھُلتا تھا۔

"چلو دیکھیں کہ اندر ہال میں کیا ہے۔" یہ بڑے دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازے تک جانے کے لیے پتھر بچھے ہوئے تھے۔ کسی زمانے میں شاید یہ حویلی تک کا پکّا راستہ ہوگا۔ انھوں نے دروازہ کھولا۔ ہال میں اندھیرا تھا۔ ایسا لگا اندھیرے میں کوئی "چیز" حرکت کر رہی ہے۔ خوف زدہ ہو کر یہ لوگ باہر بھاگے۔ زاہد کے ہاتھ سے بندوق چھوٹ گئی۔ عابد اور شبیر زیادہ خوف زدہ تھے، اچانک زاہد کی نظر اس "چیز" پر پڑی۔

"دیکھو!" وہ چیخا۔ "یہ تو کتّا ہے۔"

عابد اور شبیر نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک کم زور سا گندا کتّا، ان لوگوں سے زیادہ خوف زدہ دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ ان لوگوں کو دیکھ کر دُم دبا کر بھاگ گیا۔ تینوں دل ہی دل میں بڑے شرمندہ ہوئے۔ تھوڑی دیر تک تو انھیں کچھ نظر نہ آیا، جب ان کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہوئیں، تو انھوں نے دیکھا کہ کچھ چمگادڑیں چھت سے لٹکی ہوئی ہیں۔ دیواروں پر مکڑیوں نے جالے تان رکھے ہیں۔

"ایسا لگتا ہے، صدیوں سے یہ جگہ ویران پڑی ہے۔" زاہد نے کہا۔

"مگر دیکھو یہ قدموں کے نشانات، یہ یقیناً ہمارے نہیں ہیں۔ کوئی یہاں آیا ضرور ہے۔"

قدموں کے نشانات مٹی کی موٹی تہ پر خاصے واضح تھے۔

"یہ اُس چھوٹے کمرے کی طرف جا رہے ہیں۔" شبیر نے کہا۔

تینوں چھوٹے کمرے کی طرف گئے۔ اس کمرے میں اور بھی اندھیرا تھا۔ صرف ایک پتلی سی روشنی کی لکیر ٹوٹی چھت سے آرہی تھی۔ یہ کمرا خاصا صاف تھا۔ زمین پر ایک طرف ایک دھاری دار دری بچھی ہوئی تھی۔ ایک طرف سگرٹ کے ٹکڑے اور خالی ماچس پڑی تھیں۔

"کسی نے حال ہی میں اس کمرے کو استعمال کیا ہے۔" زاہد نے کہا۔

"مگر کس کے لیے ...؟" ابھی الفاظ شبیر کے مُنھ میں ہی تھے کہ اسے قدموں کی آواز آئی۔

"جلدی۔" اس نے سرگوشی کی، "کوئی آرہا ہے، چلو برابر کے کمرے میں چھُپ جائیں۔"

اگلا کمرا اور بھی زیادہ تاریک تھا، اس میں کوئی کھڑکی نہ تھی اور نہ اس کی چھت کہیں سے ٹوٹی ہوئی تھی کہ روشنی اندر آسکے۔ یہ کمرا گرد سے اٹا ہوا تھا، مگر ان لوگوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ یہاں چھُپ جائیں۔

ابھی وہ کمرے میں آئے ہی تھے کہ انھیں دو سائے پہلے والے چھوٹے کمرے کی طرف جاتے دکھائی دیے۔

عابد، شبیر اور زاہد اندھیرے کمروں میں اور پیچھے کی طرف سرک گئے۔ سانس روکے وہ ان لوگوں کی گفت گو سُن رہے تھے۔

۱۰

"ہاں تو کراچی والا معاملہ تو پورا ہو گیا۔ شکور مال آج عزیز کو دے دے گا۔"

"اور جو حشیش حیدر آباد کے لیے تھی؟"

"بھولا اسے کل لے گیا تھا۔"

"باقی مال بھی جلد نکل جانا چاہیے۔"

"بہتر چیف۔ میں آج رات ہی مال کوئٹہ پہنچا دوں گا۔"

دونوں آدمی اچھی خاصی بلند آواز سے باتیں کر رہے تھے۔ ایک ایک لفظ سمجھ میں آ رہا تھا۔ دونوں آوازوں میں سے ایک خاصی جانی پہچانی لگ رہی تھی مگر یہ کس کی آواز تھی؟

"بھولا بہت ہی لاپروا ہے۔ آج اس نے اپنا سگنلنگ بکس گرا دیا تھا۔ وہ تو اتفاق ہے کہ مجھے مل گیا ورنہ تو ہمارا کام ہو جاتا!"

اچانک ہی دونوں بھائیوں کو یاد آ گیا۔ یہ آواز تو اس گیروے کپڑوں والے کی تھی، جس سے وہ آج صبح ہی ملے تھے! وہی نرم لہجہ۔ ٹھیرا ٹھیرا انداز۔

"گیروے کپڑوں والا!" عابد نے چپکے سے زاہد کے کان میں کہا۔

وہ دونوں سخت حیران تھے۔

"ہم لوگوں کو اب کوئی جگہ تلاش کرنی چاہیے۔ حویلی اب محفوظ نہیں رہی۔"

"کیوں؟ میرے خیال میں تو یہ بہت محفوظ جگہ ہے۔" دوسری آواز کرخت سی تھی!

"پتا ہے آج صبح کیا ہوا۔ مجھے دو لڑکے ملے جو حویلی کی طرف آ رہے تھے۔"

"کیا؟"

"اور بڑی مشکل سے میں نے انھیں بھوتوں کی کہانی سنا کر یہاں آنے سے روکا۔"

اندھیرے ہی میں زاہد نے سر ہلایا۔ تو یہ تھی حقیقت، بھوتوں کی! اب تو شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ یہی وہ شخص تھا جس نے انھیں وہ کہانی سنائی تھی۔

"اور زیادہ پریشانی کی بات یہ ہے کہ یہ بچے حامد حسین خان کے بھتیجے ہیں۔"

"اچھا! فاریسٹ آفیسر کے بھتیجے۔ اب تو واقعی ہمیں یہ جگہ فوراً چھوڑ دینی چاہیے۔" دوسرے شخص نے کہا۔

"اب اتنے بھی زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے بچوں کے دل میں بھوتوں کا خوف بٹھا دیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کو گاؤں کے راستے کے بجائے جنگل کی طرف کا راستہ دکھا دیا ہے۔"

یہ سن کر دونوں بھائی مسکرائے۔ تو یہ دونوں منشیات کے اسمگلر تھے۔ ان کے لیے کسی کو قتل کر دینا بھی آسان تھا۔

کمرے کی مٹی سے تینوں پریشان تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ ایسا لگتا تھا، بہت وقت گزر گیا۔ وہ دونوں شاید کوئی چیز باندھ رہے تھے۔ ان کے چیف نے کہا، "تازہ مال کب تک آئے گا؟"

"دو ایک دن میں آ جائے گا۔"

"چلو پھر چلیں۔"

اب ان کے جانے کی آواز آئی۔ تینوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسی وقت زاہد کو بڑے زور سے چھینک آئی۔ اس نے بہت کوشش کی کہ چھینک رک جائے مگر نہ روک سکا۔

"کون ہے؟" کرخت آواز والا چیخا، "شکر ہے میرے پاس بندوق ہے۔"

"ٹھیرو ابھی دیکھے لیتے ہیں۔ میرے پاس ٹارچ ہے۔" پھر وہی مطمئن انداز۔

قدموں کی آواز، بچوں کے قریب آتی گئی۔ چیف نے ٹارچ سے کمرے میں روشنی پھینکی۔ تینوں روشنی میں نہا گئے۔ ایک لمحے کو تو چیف سن ہو گیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا! تھوڑی دیر بعد اس نے اسی نرم لہجے میں کہا:

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟"
"ہم آپ کے بھوتوں کو دیکھنے آئے تھے۔" زاہد نے جرأت سے کہا۔
"بہت بہادر ہو۔" اب وہ پینٹ شرٹ میں تھا اور اس کا چمکیلا منڈا ہوا سر بھی ہیٹ میں چھپا ہوا تھا۔
"چیف! لڑکوں کو یہیں ٹھنڈا کر دو۔" اس شخص کا کرخت چہرہ خونی آنکھیں اور خوف ناک انداز صاف ظاہر کرتا تھا کہ وہ کوئی پیشہ ور قاتل ہے۔
"نہیں چھوٹو! یہاں نہیں۔ ہم کو انھیں یہاں سے لے جانا ہے۔"
چیف نے کہا اور ٹارچ بجھا دی۔ پھر جیب سے ریوالور نکالتے ہوئے کہا:
"دکھاؤ تمھاری شاٹ گن بھری ہوئی تو نہیں ہے۔" جب اسے اطمینان ہوگیا تو اس نے کہا، "سنو بچّو! ہم آرام سے باہر جائیں گے۔ چھوٹو تم سے آگے آگے چلے گا۔ میں تمھارے پیچھے ہوں گا۔ یاد رکھو! بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ گولی تمھاری جسم سے پار ہوگی۔ سمجھ گئے؟"
تینوں خاموش رہے۔
"چلو۔" چیف نے حکم دیا۔
تینوں باہر نکلے۔ اچانک عابد کو ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑا۔
"پیارے بیٹے، بے ہوش نہ ہو جانا۔" بڑے ہی میٹھے لہجے میں چیف نے کہا۔ "ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر تم آرام سے چلتے رہے تو ہم تمھیں ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے۔"
"میں کسی سے نہیں ڈرتا۔" عابد نے کہا۔
اور واقعی وہ خوف زدہ نہیں تھا۔ وہ جان بوجھ کر گرا تھا اور اس کا مقصد اپنا رومال وہاں گرانا تھا۔ یہ کام اس نے اتنی ہوشیاری سے کیا کہ کسی نے نہیں دیکھا۔ یہی وہ واحد نشانی تھی جو ان کا پتا بتا سکتی تھی۔

۱۱

حویلی سے باہر، دوستوں کی طرح یہ لوگ چل رہے تھے۔ دونوں مرد آرام سے بچوں کے ساتھ ساتھ تھے، جیسے چہل قدمی کر رہے ہوں۔ بچوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ان لوگوں کے کہنے پر عمل کرتے رہیں۔
چھوٹو بڑا بے چین تھا۔ بچوں کو بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ منشیات کے یہ اسمگلر کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے۔ اور پھر اس حویلی میں منشیات کی موجودگی، یہ سب چیزیں چھوٹو کو پریشان کرنے کے لیے کافی تھیں۔
"ان شیطانوں کا کیا کرنا ہے؟" اس نے پوچھا۔
"ہم انھیں قتل نہیں کریں گے۔"
"کیا؟" چھوٹو نے حیرت سے کہا۔
"میرا مطلب ہے ہم انھیں نہیں ماریں گے، بلکہ یہ لوگ خود ہی مریں گے۔"
"کیسے؟"
"ایک حادثے میں۔ یہ غلطی سے پاؤں پھسل کر کسی بلند پہاڑی سے گر سکتے ہیں یا ڈوب کر مر سکتے ہیں۔"
ایک مکروہ مسکراہٹ چیف کے چہرے پر نمودار ہوئی۔
"انھیں سانپ بھی ڈس سکتا ہے۔" اس نے حادثے کے اور امکان کے بارے میں بتایا۔
"یعنی ہم انھیں یوں ایک دم سے نہیں ماریں گے۔" چھوٹو نے پوچھا۔
"ہاں اگر یوں مارا تو پولیس ہوشیار ہو جائے گی۔ وہ ہمیں سارے مُلک میں ڈھونڈتی پھرے گی۔" چیف نے کہا۔

"یہ بھی تو سوچو کہ اگر ان میں کوئی ایک بھی زندہ بچ گیا تو۔"

"ممکن ہی نہیں۔" چیف نے اعتماد سے کہا۔ "ان کو وہاں سامنے والی پہاڑی پر لے چلو۔"

چھوٹو مُڑا اور بچّوں سے کہا، "میرے پیچھے پیچھے چلو۔"

یہ راستہ بڑا خطرناک تھا۔ ایک قطار میں یہ لوگ چلنا شروع ہوئے۔ چیف سب سے پیچھے ان کے اوپر ریوالور تانے ہوئے تھا۔

"بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔" اس نے کہا۔ مگر یہ غیر ضروری ہدایت تھی، اس لیے کہ یہاں سے ان کے بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ راستے کے دونوں طرف اس قدر گھنی جھاڑیاں تھیں کہ ان میں سے کوئی رینگ کر بھی نہیں جا سکتا تھا۔

بچّے خاموشی سے چل رہے تھے۔ اب ایک پگڈنڈی آ گئی تھی۔ چھوٹو رُکا اور بولا، "رُک جاؤ۔" اس کا لہجہ بہت سخت تھا۔

وہ پگ ڈنڈی کے اگلے سرے تک گیا۔ اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد کہ وہاں کوئی نہیں ہے اس نے دوبارہ سب کو چلنے کا حکم دیا۔ تینوں "قیدی" اس راستے سے گزر گئے۔ اب پھر گھنا جنگل شروع ہو گیا۔

یہ ایک پہاڑی راستہ تھا جو کافی اوپر تک جاتا تھا۔ تھوڑی دیر میں بچّے بہت تھک گئے۔ شبیّر کو چلنے میں سب سے زیادہ دِقّت ہو رہی تھی اس لیے کہ وہ ننگے پاؤں تھا اور چلنے سے اس کے پاؤں رگڑ کھا کر پھٹ گئے تھے۔ سوجن کے علاوہ ان سے خون بھی بہ رہا تھا۔ آخر اس کا پاؤں ایک جھاڑی سے اُلجھا اور وہ گِر پڑا۔ عابد اور زاہد نے اُسے اُٹھانا چاہا۔

"مجھے مت اُٹھاؤ۔ مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا۔" شبیّر نے کہا۔

"اُٹھ جاؤ بدتمیز لڑکے۔ اگر تم نہ اُٹھے تو میں تم کو کتّے کی موت مار دوں گا۔" چھوٹو نے غصّے سے کہا۔

شبیّر کو غصّہ تو بہت آیا، مگر کیا کر سکتا تھا۔ اس نے کوشش کی اور آہستہ

آہستہ اُٹھ ہی گیا۔ مگر اس نے چلنے سے صاف انکار کر دیا۔

"مجھے پانی چاہیے۔ میں پیاس سے مرا جا رہا ہوں۔" شبیّر نے کہا۔

"ہاں۔ دیکھو اسے بہت پیاس لگ رہی ہے پلیز اسے پانی پلوا دو۔" دونوں بھائیوں نے چیف سے درخواست کی۔

اس جگہ سے دس پندرہ گز پر ایک چشمہ بہ رہا تھا۔ عابد نے اس کی طرف اشارہ کیا، "کیا ہم اس تک پانی پینے جا سکتے ہیں؟"

"نہیں۔" چیف نے سرد مہری سے کہا۔ "صرف شبیّر جائے اور پانی پی کے آ جائے۔ ہم یہاں سے اس پر نظر رکھتے ہیں۔"

شبیّر آہستہ آہستہ اس چشمے کی طرف گیا اور پانی پیا۔ چھوٹو اور چیف اسے دیکھ رہے تھے۔ اچانک پورا علاقہ چیتے کی خوفناک دہاڑ سے گونج اُٹھا۔

"چیتا! چیتا!" شبیّر زور سے چیخا اور پیچھے کو بھاگا۔

چھوٹو اور چیف سکتے میں آ گئے۔ شبیّر پھر خوف سے چیخا اور اپنے بائیں طرف اشارہ کیا۔ پھر وہ سیدھے ہاتھ کو بھاگنا شروع ہو گیا۔ چیف اور چھوٹو کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں۔ زاہد اور عابد کو یقین ہو گیا کہ شبیر کو چیتا مار ڈالے گا۔

چند منٹ اور گزر گئے۔ اب پورے علاقے میں سنّاٹا تھا۔

"لڑکا کہاں گیا؟" چیف ایک دم چیخا۔

چھوٹو چشمے کی طرف بھاگا۔ یہاں نہ تو چیتا تھا اور نہ شبیر۔

"چیف۔" چھوٹو نے زور سے کہا۔ "لڑکا ہمیں جُل دے گیا۔"

"ہمیں اسے ڈھونڈ لینا چاہیے۔" پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "پہلے ان دونوں کو باندھ دو۔ پھر اس کی تلاش کو چلو۔"

چھوٹو نے آس پاس سے پتلی پتلی شاخیں اور سخت بیلیں اُٹھائیں اور ان کے دونوں ہاتھ پیچھے کر کے درخت سے باندھ دیے۔

"اب چلو۔ اس بدبخت کو ڈھونڈیں۔" چیف نے حکم دیا۔

"لڑکا زیادہ دُور نہیں جا سکتا۔" چیف نے کہا۔ "اس کو واپس لاؤ۔ زندہ یا مُردہ۔ اس عرصے میں میں ان دونوں پر نظر رکھتا ہوں۔"

خاصی دیر گزر گئی۔ شبیر اور چھوٹو کا کہیں پتا نہ تھا۔ چیف بے قراری سے ٹہل رہا تھا۔ آخر وہ بچوں سے کچھ فاصلے پر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ وہ ان دونوں کی طرف سے بے فکر تھا۔ یہ دونوں اچھی طرح بندھے ہوئے تھے۔ مگر چھوٹو کے ساتھ کیا ہوا؟

عابد اور زاہد بہت تھک چکے تھے ان کے ہاتھوں میں سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ یہ تو ایک دوسرے کی طرف بھی نہیں دیکھ سکتے تھے اس لیے کہ دونوں کو تنے کے ایک طرف ایک بندھا تھا اور دوسری طرف دوسرا۔

اچانک انھیں لگا کہ جھاڑیوں میں کوئی ہے۔

یہ شبیر تھا۔

اس نے ہاتھ سے انھیں بالکل خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر وہ خاموشی سے آگے بڑھا اور چاقو سے وہ مضبوط بیلیں کاٹ دیں جن سے وہ بندھے ہوئے تھے۔ پھر ان سے بہت آہستہ سے کہا، "ابھی ہلنا نہیں۔ اپنی بندوق لوڈ کر لو۔"

زاہد نے ادھر اُدھر دیکھا۔ چیف ان کی طرف سے پیٹھ کیے پتھر پر بیٹھا تھا۔ زاہد نے شاٹ گن میں ایک چھرّا بھرا۔ ابھی اس نے بھرا ہی تھا کہ چیف اُٹھا اور ٹہلنے لگا۔ وہ زیرِ لب چھوٹو کو کوس رہا تھا۔

اچانک پھر چیتے کی آواز سنائی دی۔ چیف خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے جلدی سے ریوالور سنبھالا اور درخت پر چڑھ گیا۔ اِدھر اُدھر چیتے کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ زاہد چیف کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ موقع ملتے ہی اس نے چیف پر فائر کر دیا۔

چھرا چیف کے ہاتھ پر لگا اور ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ عابد نے جھپٹ کر ریوالور اٹھا لیا۔ زاہد نے بھی شاٹ گن دوبارہ بھر لی اور چیف کے پاس آگیا۔ شبیر نے اپنا چاقو ہاتھ میں لے لیا۔

"نیچے اُترو۔ ہاتھ اوپر کر لو۔" عابد نے حکم دیا۔ "اور کوئی چال نہ چلنا ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔"

چیف خاموشی سے نیچے اتر آیا، ہاتھ اوپر کیے ہوئے۔

"درخت کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔" عابد نے کہا۔

چیف بیٹھ گیا۔

"اس کے دونوں ہاتھ باندھ دو۔ جب تک میں اس کو نظر میں رکھتا ہوں۔" عابد نے کہا۔

"زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو۔" چیف نے کہا، "چھوٹو آتا ہی ہو گا۔"

تینوں نے اس کے جملے پر کوئی غور نہ کیا اور چیف کو درخت سے باندھ دیا۔ بازی اب پلٹ چکی تھی۔

عابد نے زاہد کی طرف دیکھا، "چلو اب اپنے گاؤں کی طرف۔"

ابھی وہ روانہ ہی ہوئے تھے کہ کتّے کے بھونکنے کی آواز آئی اور اگلے ہی لمحے عابد کو ایک کتّا نظر آیا۔

"ارے یہ تو ٹامی ہے۔"

"چچا جان کہاں ہیں؟" عابد نے کہا۔

"میں یہاں ہوں بیٹے!" سامنے سے چچا آ رہے تھے۔ چچا جان کو دیکھ کر بچوں کی خوشی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

"چچا جان! چچا جان! ہم نے اسمگلروں کو پکڑ لیا۔"

چچا جان کے ساتھ چھے سات آدمی اور بھی تھے۔

"بہت خوب میرے بچو! کیا یہی وہ آدمی ہے؟" چچا نے چیف کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں، چچا جان، مگر یہ اکیلا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی ہے۔ وہ جنگل میں بھاگ گیا ہے۔" زاہد نے کہا۔

"ہم نے اسے پکڑ لیا ہے۔ ہم نے اسے ہاتھ میں پستول لیے جنگل میں گھومتا

دیکھا تو پکڑ لیا۔ پہلے تو اس نے فائر کرنے کی کوشش کی، مگر ہم نے اس پر قابو پا ہی لیا۔"

"اور ان کے پاس ایک تھیلے میں منشیات بھی ہیں، جسے انھوں نے جھاڑیوں میں چھپا دیا ہے۔"

"اچھا، فکر نہ کرو۔ یہ پولس افسر اسے بھی ڈھونڈ لیں گے اور ان لوگوں کی بھی اچھی طرح تواضع کریں گے۔ اور بچو بھی اب گھر چلو۔ دیکھیں جمن نے آج رات کے لیے کیا کیا پکایا ہے۔"

۱۲

تینوں لڑکے اب آرام سے حامد حسین خان کے گھر میں بیٹھے تھے۔

"تم لوگ خوش قسمت ہو کہ ان لوگوں سے بچ نکلے۔" چچا جان نے کہا اور واقعی سوائے تھوڑی سی تکلیف اور پاؤں کے زخم کے، انھوں نے کوئی پریشانی نہ اٹھائی کوئی زخم نہ کھایا۔

"چچا جان! آپ وہاں کیسے پہنچ گئے؟ آپ نے تو کہا تھا کہ شام سے پہلے نہیں لوٹیں گے۔" عابد نے پوچھا۔

"یہ ٹھیک ہے۔ مگر اسمگلروں کا یہی وہ گروہ تھا، جس کے بارے میں بات کرنے کے لیے چوہدری زمان نے مجھے بلایا تھا۔ انھیں اطلاع ملی تھی کہ اسمگلر اس پرانی حویلی کو استعمال کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا جال نہ صرف پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے، بلکہ یہ لوگ منشیات باہر بھی اسمگل کرتے ہیں۔ ہم دونوں مل کر اس معاملے کی تحقیق کر رہے تھے۔" چچا جان نے کہا۔

"اچھا تو ان سے مل کر آپ واپس آگئے؟" زاہد نے کہا۔

"ہاں۔" چچا جان نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔ "اور اگر راستے میں جیپ خراب نہ ہو جاتی تو ہم اور بھی جلد اس ویران حویلی تک پہنچ جاتے۔"

"کتنا اچھا ہوتا! کاش آپ وہاں پہلے پہنچ جاتے۔ ہم پکڑے تو نہ جاتے!" عابد نے کہا۔

"آپ کس وقت حویلی پہنچے؟" زاہد نے پوچھا۔

"تقریباً تین بجے۔" چچا جان نے جواب دیا۔

"بس اسی وقت تو ہمیں جنگل میں چلنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔" زاہد نے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ شروع سے ہی ہماری تلاش میں تھے۔"

"نہیں۔" چچا جان نے کہا، "مجھے تو یہ خیال بھی نہ تھا کہ تم حویلی کی طرف گئے ہو گے۔ جب میں سادہ کپڑوں میں پولس والوں کے ساتھ حویلی کی طرف گیا تو پتا چلا کہ حویلی واقعی استعمال ہو تی رہی ہے۔ جب ٹامی نے عابد کا رومال اُٹھایا اور مجھے لاکر دیا تو ہمیں ڈر ہوا کہ تم لوگ پکڑے گئے ہو۔"

"عابد کا رومال؟" زاہد نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں بھائی، میں نے جان بوجھ کر اسے وہاں پھینک دیا تھا، تمھیں یاد ہے حویلی سے نکلتے ہی میں گر پڑا تھا۔ میں نے خود ہی گر کر رومال گرایا تھا کہ یہی ایک چیز کسی کو ہم تک پہنچا سکتی ہے۔" عابد نے کہا۔

"یہ تو تم نے بہت عقل مندی کی۔" چچا جان نے کہا۔ "ورنہ تو میں زندگی بھر تمھیں نہ ڈھونڈ سکتا تھا۔ ٹامی رومال اُٹھا کر بھونکتا ہوا جنگل کی طرف چلا۔ اس نے تمھاری بُو پالی تھی۔ آخر کو شکاری کتا ہے!"

"شاباش ٹامی! شاباش۔" عابد نے کتّے کی پیٹھ تھپتھپائی۔

"آدھے گھنٹے تک جنگل میں چلنے کے بعد وہ آدمی ملا۔ ہم بہت محتاط تھے۔ اس لیے کہ ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ اسمگلر کتنے ہیں؟"

"چچا جان! آپ کو پتا ہے ہمارے ساتھ ایک بہت ہی مددگار چیتا تھا۔" زاہد نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی۔ شبیّر! تم نے بہت عقل مندی کی۔" چچا جان نے کہا۔

"تم نے چشمے سے بھاگ کر کیا کیا؟" زاہد نے پوچھا۔

"میں فوراً ایک درخت پر چڑھ گیا۔ چھوٹو کو پریشان بھاگتے ڈھونڈتے دیکھ کر مجھے بڑا مزہ آ رہا تھا۔" وہ بہت زور سے ہنسا۔ سب ہنسنے لگے۔

"چھوٹو کو پتا چل جائے کہ تم نے یہ شرارت کی ہے تو وہ غصّے سے پاگل ہو جائے۔" زاہد نے کہا۔

اسی وقت جمن نے آکر بتایا کہ کھانا تیار ہے۔

"چلو بھئی اب خوب سیر ہو کر کھانا کھاؤ اور سیدھے جا کر سو جاؤ۔"

"کیا شبیّر بھی؟"

"ہاں، میں نے شبیر کے گھر کہلا بھیجا ہے کہ وہ آج رات ہمارے ہاں گزارے گا۔"

"بہت خوب۔ چچا زندہ باد۔" تینوں لڑکے ایک ساتھ چیخے۔

دوسرے دن ابھی وہ ناشتا کر ہی رہے تھے کہ چوہدری زمان کا خط آ پہنچا۔ خط پڑھنے کے بعد چچا جان نے کہا، "چوہدری صاحب نے کل مجھے بلایا ہے اور تم تینوں کو بھی۔"

"میرے خیال میں پولس ہم سے کچھ پوچھ گچھ کرے گی۔" زاہد نے کہا۔

چچا جان نے کچھ جواب نہ دیا۔

"میں تو اس قابل نہیں ہوں کہ کہیں جاؤں۔ میرے پاؤں زخمی ہیں۔" شبیّر نے کہا۔

"اور میرے تو گھٹنوں میں سخت درد ہو رہا ہے۔" عابد نے کہا

"اور مجھ سے تو دو قدم بھی چلا نہیں جائے گا۔" زاہد نے فوری فیصلہ کیا۔

"ارے بھئی، دوپہر کا اتنا اچھا کھانا کیا تم لوگ چوہدری صاحب کے ساتھ نہیں کھاؤ گے؟"

"کھانا؟" تینوں ایک ساتھ بولے۔

"ہاں۔" چچا جان مسکراتے ہوئے بولے۔ "وہ تم تینوں سے ملنا چاہتے ہیں اور شاباش دینا چاہتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے تمھیں کھانے کی دعوت دی ہے۔"

تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ سارے زخم ایک دم ٹھیک ہو گئے۔ سارے درد بھاگ گئے۔ شاید یہ دعوت نامے کا اثر تھا!

چوہدری صاحب کے ہاں کھانا بہترین تھا۔ بریانی، شامی کباب اور ان لوگوں کا پسندیدہ کڑاہی گوشت، گرم گرم نان کے ساتھ۔ میٹھے میں فروٹ کسٹرڈ تھا اور آخر میں سب سے بڑھ کر بہترین میٹھے آم!

جب یہ لوگ واپس آئے تو عابد نے شبیر سے کہا:

"صرف تمھاری وجہ سے ہی ہماری جانیں بچیں اور ہم نے یہاں بہترین وقت گزارا، یہ واقعہ زندگی بھر یاد رہے گا۔ اب تم ہمارے گھر آؤ اور ہمارے پاس کچھ دن گزارو۔ یقیناً ہم وہاں بھی بہت اچھے دن گزاریں گے۔" زاہد نے کہا

"ہاں اور ایک یادگار دعوت کھائیں گے آج کی طرح۔" چچا جان نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں، مگر تم چیتے کی طرح زور سے امّی کے سامنے دہاڑنا نہیں۔ ورنہ وہ تمھیں تالے میں بند کر دیں گی۔" زاہد نے شبیر کو نصیحت کی۔

جمال کی ہوشیاری

جمال کو بچپن ہی سے سر سبز درختوں، اونچے پہاڑوں، اُچھلتے اُبلتے چشموں اور بل کھاتی ندیوں سے محبّت تھی۔ وہ اِسی فضا میں رہتا تھا، اُسے جنگلوں میں گھومتے پھرتے رہنا اچھا لگتا تھا، ابھی وہ دس سال ہی کا تھا کہ اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ شہروں سے دُور اپنی زندگی جنگلوں ہی میں گزارے گا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس کا یہ ارادہ پکّا ہوتا گیا اور اُس نے سوچ لیا کہ وہ جنگلات کے محکمے میں کام کرے گا اور اس کے لیے جنگلات کی اعلا تعلیم حاصل کرے گا۔

جب جمال نے انٹر کا امتحان پاس کیا تو اس کی عمر سترہ سال تھی اب اس کو فیصلہ کرنا تھا کہ وہ کیا کرے۔ ملک میں جنگلات کی تعلیم کا ایک ہی کالج تھا جہاں چار سال کا کورس کر کے وہ ایم ایف یعنی ماسٹر اوف فاریسٹری کی ڈِگری حاصل کر سکتا تھا لیکن یہ کالج مہنگا تھا اور جمال ایک غریب گھرانے کا لڑکا تھا۔

جمال نے جب انٹر پاس کیا تو اُس کے پاس اپنے جیب خرچ میں سے بچائے ہوئے صرف سو رُپے تھے لیکن وہ ایک حوصلہ مند لڑکا تھا۔ اس نے سوچا کہ کالج کھلنے تک گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ کوئی ملازمت کر کے رپیہ جمع کر لے گا اس نے اخباروں میں "ضرورت ہے" کے اشتہار پڑھنے شروع کر دیے۔ ایک دن ایک اشتہار پر اُس کی نظر پڑی۔ یہ شمالی فاریسٹ سرکل کے چیف فاریسٹ آفیسر کی طرف سے تھا جس میں کہا گیا تھا کہ خانس پور کی چوکی کے لیے ایک آدمی

کی ضرورت ہے جو جنگل کی نگرانی کرے اور جنگل میں آگ لگنے کی اطلاع دے سکے۔ تنخواہ ایک ہزار رُپے مہینہ اور مفت رہائش۔ جمال یہ اشتہار دیکھ کر خوش ہو گیا اور مقررہ تاریخ پر اپنی درخواست لے کر چیف فاریسٹ آفیسر کے دفتر میں پہنچ گیا۔

چیف فاریسٹ آفیسر نے اُس سے پوچھا: "تم کس کام سے آئے ہو؟"

"جی، میں ملازمت کے لیے آیا ہوں، وہ جو آپ نے خانس پور کے لیے اشتہار دیا ہے۔" جمال نے نہایت ادب سے جواب دیا۔

چیف فاریسٹ آفیسر نے جمال کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور بولا:

"تمھیں معلوم ہے یہ کس قسم کا کام ہے؟"

"جی نہیں۔ لیکن میں جنگل میں آگ کی بہت اچھی نگرانی کر سکتا ہوں۔"

"تم ابھی لڑکے ہو اور یہ کام تمھارے بس کا نہیں ہے۔ محنت تو زیادہ نہیں ہے لیکن واچ ٹاور میں اکیلا رہنا پڑتا ہے اس لیے جسے جنگل کا ماحول پسند نہ ہو وہ پورے وقت ٹِکتا نہیں، پہلے ہی بھاگ جاتا ہے۔ سات میل اندر جنگل میں یہ واچ ٹاور ہے اور قریب میں کوئی آبادی بھی نہیں ہے۔ دن رات چوبیس گھنٹے وہاں رہنا ہوتا ہے۔ ٹیلے فون ہے لیکن اس پر اِس دفتر کے سِوا کہیں اور بات نہیں ہو سکتی۔ مہینے میں دو مرتبہ ایک آدمی کھانے پینے اور دوسری ضرورت کا سامان لے کر وہاں جاتا ہے۔ کبھی کبھار میں بھی چکّر لگا لیتا ہوں۔ گرمیوں بھر تمھیں وہاں اکیلے ہی رہنا ہو گا، کوئی دوسرا آدمی نظر نہیں آئے گا۔ کیا تم وہاں اس طرح رہ لوگے؟"

جمال خاموشی سے سُنتا رہا پھر بولا، "جی ہاں۔ میں رہ لوں گا مجھے جنگل پسند ہیں۔ میں اکیلا پن محسوس نہیں کروں گا۔"

چیف فاریسٹ افسر نے جمال کو ایک بار پھر غور سے دیکھا اور کہنے لگا، "ایسا کیوں نہیں کرتے کہ اپنے کسی دوست کو لے آؤ۔ دونوں ساتھ رہو، آدھے وقت تم کام کرو، آدھے وقت وہ اور جو تن خواہ ملے وہ آدھی آدھی

بانٹ لو۔ ایک طرح سے تم دونوں کی تفریح بھی ہو جائے گی۔"

جمال نے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا، "جی نہیں مجھے رُپے کی ضرورت ہے۔ میں اپنی تن خواہ میں کسی کو شریک نہیں کر سکتا۔

چیف فاریسٹ آفیسر سوچ میں پڑ گیا۔ ایک وقت وہ بھی ایسا ہی ایک نوجوان لڑکا تھا اور اسی کی طرح ضرورت مند۔ پھر وہ نرمی سے بولا، "تمھیں رُپے کی کیا ضرورت پڑ گئی ہے؟"

جمال نے اُسے بتایا کہ وہ فاریسٹ کالج میں داخلہ لینا چاہتا ہے اور اس کے لیے اسے رقم چاہیے۔

چیف فاریسٹ افسر مسکرا دیا۔

"اچھا تو تم فاریسٹ سروس میں آنا چاہتے ہو۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اب میں تمھاری درخواست کس طرح رد کر سکتا ہوں۔"

ایک ہفتے کے اندر اندر جمال کو یہ نوکری مل گئی اور وہ دو ہفتوں کے اندر اُن کے ساتھ خانس پور کی مشاہداتی چوکی پر پہنچ گیا۔ محکمۂ جنگلات نے اس کو اس کے کام سے متعلق جو سامان اور آلات وغیرہ دیے تھے ان کے علاوہ وہ اپنے ساتھ اپنی کچھ کتابیں، الارم والی ایک چھوٹی گھڑی اور ایک کیمرا جو اس کے دوست نے اس کو دیا تھا، اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

خانس پور کی چوکی اصل میں ایک اونچی پہاڑی پر بنا ہوا پتھروں کا بیس فیٹ اونچا گول ٹاور تھا۔ نیچے ایک چھوٹا سا باورچی خانہ تھا، اس کے اوپر سونے کا کمرا اور تیسری منزل پر نگرانی کا کمرا تھا جس میں چاروں طرف کھڑکیاں تھیں۔ ان سے دُور دُور کا منظر صاف نظر آتا تھا، میلوں تک پھیلے گھنے جنگل، سرسبز پہاڑیاں، وادیاں اور ندی نالے۔ آسمان صاف ہوتا تو دن میں مغرب کی سمت دُور جھیل کا پانی سورج کی کرنوں سے جھلمل جھلمل کرتا دکھائی دیتا اور رات کو میلوں دُور شہر کی روشنیاں بھی ستاروں کی طرح ٹمٹماتی نظر آتیں۔

اس خوب صورت علاقے میں جمال کی ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ چاروں طرف نظر رکھے

اور اگر کہیں دھواں اُٹھتا نظر آئے تو نقشے میں اس جگہ کا صحیح تعین کر کے فوراً ٹیلے فون پر چیف فارسٹ آفیسر کے دفتر کو اس کی اطلاع دے۔ کئی سال سے خوش قسمتی سے بارشیں خوب ہو رہی تھیں اس لیے کہیں کوئی بڑی آگ نہیں لگی تھی صرف دو ہی معمولی واقعات آگ لگنے کے ہوئے تھے۔

چیف فاریسٹ آفیسر اکثر جمال کو فون کیا کرتے تھے۔ ایک تو یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ اپنی ڈیوٹی پر موجود ہے یا نہیں اور دوسرے اُنھیں اس لڑکے سے کچھ اُنسیت سی ہوگئی تھی۔ جمال اپنی ڈیوٹی کے معاملے میں بہت سنجیدہ تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کا کیا فرض ہے اور وہ اس فرض کو پوری ذمہ داری اور دیانت داری سے انجام دے رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ واچ ٹاور سے نکل کر ان ہرے بھرے جنگلوں میں گھومے پھرے، پہاڑوں پر چڑھے۔ لیکن وہ کبھی ٹاور سے اتنی دُور نہیں گیا کہ ٹیلے فون کی گھنٹی کی آواز اس کو نہ سنائی دے۔ اس لیے وقت بے وقت جب بھی چیف نے فون کیا وہ وہاں موجود ہوا۔ دفتر کا آدمی پندرہ دن کے بعد کھانے پینے کا سامان لے کر آتا تھا اور چیف فاریسٹ آفیسر نے بھی ان دو ڈھائی مہینوں میں دو تین چکّر خانس پور کی چوکی کے لگائے لیکن زیادہ تر جمال اکیلا ہی رہا۔ ایک دوربین ہی اُس کی ساتھی تھی جس سے وہ دُور دُور کسی آدمی کو آتے جاتے دیکھ لیتا تھا۔

۲

اگست کے مہینے میں ایک دن تیسرے پہر چیف کا فون آیا۔ اُنھوں نے جمال کو بتایا کہ وہ چند دن کے لیے اسلام آباد جا رہے ہیں۔ اُن کے پیچھے اصغر صاحب انچارج ہوں گے۔ اگر کوئی بات ہو تو وہ اُنھی کو بتائے۔

جمال نے پوچھا، "اور تو سب ٹھیک ہے۔ کوئی خاص خبر تو نہیں؟"

چیف نے جواب دیا: "ہاں کوئی خاص بات نہیں سوائے اس کے کہ کل رات کمرشل بنک میں ڈاکہ پڑ گیا اور ڈاکو ایک لاکھ رُپے لوٹ کر لے گئے۔ پولس کا خیال ہے کہ ڈاکو پشاور کی طرف گئے ہیں۔ اچھا اللہ حافظ۔"

جمال کو ڈاکے کی خبر سے کوئی دل چسپی نہ تھی لیکن نہ جانے کیوں یہ خبر اُس کے ذہن پر اس قدر سوار رہی کہ جب رات کو آہٹ سے اس کی آنکھ کھلی اور اُس نے دیکھا کہ تین آدمی اس کے بستر کے پاس کھڑے ہیں جن میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک پستول ہے تو وہ یہ سمجھا کہ وہ کمرشل بنک میں ڈاکے کے بارے میں خواب دیکھ رہا ہے۔

"اٹھو،" اس آدمی نے جو پستول لیے ہوئے تھا جمال کو ڈانٹ کر کہا اور ہمارے لیے کھانے کا انتظام کرو۔"

جمال اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ "تم کون ہو؟" اُس نے پوچھا۔

"اس کی فکر نہ کرو۔" اس نے جواب دیا۔

جمال نے کمرے میں نظریں گھما کر دیکھا۔ اُس آدمی نے پھر ڈانٹا، "گڑبڑ کرنے کی ضرورت نہیں۔ چپ چاپ اُٹھ کر کھانے کا انتظام کرو، ورنہ تمھاری خیر نہیں ہے۔"

جمال جلدی سے بستر سے اُٹھ گیا اور نیچے جانے لگا ، دو آدمی اس کے سامنے
نیچے آئے ، پھر تیسرا بھی آگیا۔ جمال نے کھانے کی چیزیں میز پر رکھ دیں اور وہ
تینوں بھوکوں کی طرح ان پر پل پڑے۔ جمال کی نظر فرش پر پڑی تو اس نے
دیکھا کہ کینوس کے تین تھیلے پڑے ہیں جن کو وہ آدمی تھوڑی تھوڑی دیر بعد دیکھ
لیتے ہیں۔ اب پو پھٹ رہی تھی جمال کو ان تینوں کے چہرے زیادہ صاف نظر آئے
ان سے سفاکی ٹپک رہی تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کر اُس آدمی نے جس کے ہاتھ میں پستول تھا اور جو ان کا
سرغنہ معلوم ہوتا تھا سخت لہجے میں جمال سے بولا:

" چلو اوپر، اور دیکھو اگر نیچے اُترنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا، سمجھے"

جمال کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ شخص جو کہہ رہا ہے وہ کر گزرے گا۔ وہ
چُپ چاپ زینے پر چڑھ گیا اور آخری منزل پر نگرانی کے کمرے میں آکر
بیٹھ گیا۔ وہ اکیلا ان تین مسلح آدمیوں کے مقابلے میں اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

" یہ اوپر جاکر کوئی گڑبڑ نہ کرے" ایک آدمی نے کہا۔

" یہ کچھ نہیں کر سکتا" پستول والا بولا" میں نے ٹیلے فون پہلے ہی کاٹ
دیا ہے۔"

جمال نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ ٹیلے فون کا تار کٹا ہوا تھا اور اُس کا
دوسرا سرا کوئی سو فیٹ دُور ایک چٹان پر کھمبے سے لٹک رہا تھا۔ وہ زینے پر آیا
جہاں سے اس کو نچلی منزل پر باورچی خانے میں رکھی ہوئی کھانے کی میز نظر آرہی
تھی۔ وہ تینوں آدمی کینوس کے تھیلے میز پر خالی کر رہے تھے۔ ان سب میں نوٹ
بھرے ہوئے تھے۔ کچھ پرائز بونڈ وغیرہ بھی تھے۔ اچانک ان کے سرغنے کی نظر اوپر
اُٹھی، اس نے جمال کو دیکھا کہ وہ ان کو دیکھ رہا ہے۔ اس نے نہایت تیزی سے
اپنا پستول نکالا اور جمال پر گولی چلا دی۔ یہ جمال کی خوش قسمتی تھی کہ گولی اس سے
چند انچ کے فاصلے سے گزر کر چھت میں جا لگی ورنہ اس کی موت یقینی تھی۔

اب جمال کو پتا چل گیا تھا کہ یہ وہ ڈاکو ہیں جنھوں نے کمرشل بنک لوٹا ہے اور

پہاڑوں کی طرف جانے کی بجائے اِدھر جنگل میں آگئے ہیں۔ وہاں تو پولس شاہراہوں
پر کاروں کو روک کر تلاشی لے رہی ہوگی اور ریلوے اسٹیشنوں کی نگرانی کر رہی
ہوگی اور یہاں جنگل میں یہ ڈاکو اطمینان سے بیٹھے نوٹ گن رہے ہیں۔ ان ڈاکوؤں
کے علاوہ ایک اور شخص ایسا ہے جو اِس راز سے واقف ہے لیکن وہ بے بس،
اس کمرے میں قید ہے۔

واچ ٹاور سے نکلنا ممکن نہ تھا۔ کھڑکی سے بیس فیٹ نیچے پہاڑی چٹانوں
پر کودنے کا مطلب تھا ہاتھ پاؤں تڑوانا۔ جمال نے سوچا، وہ انتظار کرنے
کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ چناں چہ وہ کھڑکی کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس طرح دوپہر
ہوگئی۔ اچانک اس نے دیکھا کہ جنگل سے ہو کر آنے والے راستے پر محکمۂ جنگلات
کا وہ آدمی چلا آرہا ہے جو اُس کے کھانے پینے کا سامان لے کر آیا کرتا تھا۔ اُسے
اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ نتائج کی پروا کیے بغیر وہ کھڑکی میں سے سر
نکال کر چیخا۔

" تین ڈاکو نیچے بیٹھے ہیں۔ وہ تمھیں مار ڈالیں گے۔ واپس بھاگ جاؤ"

جمال کی آواز سن کر وہ آدمی ایک لمحے کے لیے رُکا لیکن پھر چل پڑا۔ اتنے
میں ڈاکوؤں کا سرغنہ بڑے اطمینان سے باہر نکلا اور اس آدمی سے ہاتھ ملا کر
باتیں کرنے لگا۔

" اچھا تو یہ آدمی بھی ڈاکوؤں سے ملا ہوا ہے" جمال کا دل ڈوب گیا ایک امید
پیدا ہوئی تھی کہ یہ آدمی واپس بھاگ کر خبر کر دے گا وہ بھی ختم ہوگئی۔ اب
یہاں کون آئے گا؟ ڈاکو نجانے کب تک یہاں رہیں گے وہ نجانے اس کا
کیا حشر کریں گے۔ وہ اسے جانے نہیں دیں گے۔ وہ ان کا راز جان گیا ہے،
وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ صورت سے ظالم لگتے ہیں۔

جمال کو نیچے سے ان لوگوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ زینے کے
پاس فرش پر لیٹ گیا اور نیچے کی طرف کان لگا کر سُننے لگا۔ محکمۂ جنگلات کا آدمی
انھیں بتا رہا تھا کہ پولس سختی سے تلاشی لے رہی ہے۔ انھیں اس سے بہت خوشی

ہوئی کہ پولیس کے خیال میں وہ مغرب یا شمال کی طرف گئے ہیں اور انھوں نے مطمئن ہو کر اونچی آواز میں اپنے آئندہ پروگرام کے بارے میں باتیں کرنا شروع کر دیں۔ انھوں نے طے کیا کہ جب اندھیرا ہو جائے گا تو وہ الگ الگ راستوں سے جنگل سے نکل کر سب سے قریب کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ جائیں گے اور ریل میں بیٹھ کر فرار ہو جائیں گے۔ جنگلات کے محکمے کا راشن لانے والا آدمی معمول کے مطابق واپس چلا جائے گا لیکن اُسے جاتے ہی ایک تار ملے گا کہ اُس کے بھائی کا کراچی میں انتقال ہو گیا ہے۔ اس تار کو دیکھتے ہی وہ کراچی جانے کے بہانے نکل بھاگے گا۔

"اور اس لڑکے کا کیا ہو گا؟" کسی نے سوال کیا۔

سرغنے نے کہا، "اسے یہاں باندھ کر چھوڑ جائیں گے۔ اب اگر وہ بھوک پیاس سے مر گیا تو مر جائے۔ اس کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

جمال یہ سُن کر کانپ اُٹھا۔

تھوڑی دیر بعد جنگلات کے محکمے کا ملازم اوپر آیا اور جمال سے بولا "تمھیں اگلی مرتبہ جو چیزیں منگانا ہوں ان کی فہرست بنا لو۔ میں تین بجے واپس چلا جاؤں گا۔"

اس نے ڈاکوؤں سے اپنی دوستی کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ جمال نے سوچا کیا وہ اُسے بے وقوف سمجھتا ہے کہ اس نے جو کچھ دیکھا ہے اُس کے بعد بھی وہ کسی غلط فہمی میں رہے گا۔ بہرحال اُس نے سوچا کہ وہ بھی خاموش رہے گا اور اس کے کہنے کے مطابق سامان کی فہرست بنا کر دے دے گا۔

تھوڑی دیر میں جمال کو باہر کا دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز آئی۔ اُس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ راشن والا آدمی اور تینوں ڈاکو درختوں کے سایہ میں چٹانوں پر کمبل بچھا رہے تھے۔ وہ ساری رات جاگنے اور پہاڑی جنگل میں چلنے کے بعد تھک گئے تھے اور آرام کرنا چاہ رہے تھے۔ ٹاور کے دروازے کو بند کر کے انھوں نے باہر سے تالا ڈال دیا تھا

اور جمال کی طرف سے بے فکر ہو گئے تھے۔ جلد ہی وہ تینوں گہری نیند سو گئے۔

جمال سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ اس کی جان سخت خطرے میں تھی۔ ڈاکو صورت ہی سے خوں خوار نظر آ رہے تھے۔ وہ یقیناً اسے ٹاور میں باندھ کر چھوڑ جائیں گے تاکہ وہ بھوکا پیاسا مر جائے۔ اس نے سوچا ایسا وقت آنے سے پہلے وہ کھڑکی میں سے کود جائے گا چاہے جیے یا مرے۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اُس کی نگاہ گھڑی پر پڑی جو سامنے میز پر رکھی ٹِک ٹِک کر رہی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا الارم کلاک تھا بیٹری سے چلنے والا۔ اس کی خاص بات یہ تھی کہ اتنا چھوٹا سا ہونے کے باوجود اس کا الارم بہت تیز تھا۔ گہری سے گہری نیند سونے والے کو بھی جگا دیتا تھا۔ اس کی آواز دُور تک جاتی تھی۔ گھڑی پر نظر پڑتے ہی جمال کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ دو منٹ تک وہ سوچتا رہا، پھر خاموشی سے اُٹھا اور چپکے چپکے نیچے باورچی خانے میں آیا۔ نوٹوں سے بھرے ہوئے تینوں تھیلے میز کے نیچے پڑے ہوئے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ کھول کر دیکھے مگر ایک ایک لمحہ قیمتی تھا اور وہ اسے ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے جو ترکیب سوچی تھی اس پر عمل کرنا تھا۔

جمال نے مکئی کے دلیے سے بھرا ایک ڈبا اُٹھایا۔ اُس میں سے دو تہائی دلیہ نکال کر ایک پلیٹ میں رکھ لیا پھر جو دلیہ ڈبے میں باقی رہ گیا اُسے ایک سا کر دیا اور اس کے اوپر کوفی کا ایک خالی ڈبا رکھ دیا۔ پھر اس نے ایک کاغذ قلم لے کر لکھنا شروع کیا:

کمرشل بنک میں ڈاکہ ڈالنے والے تینوں ڈاکو خانس پور کے واچ ٹاور میں ہیں۔ لوٹی ہوئی رقم بھی ان کے پاس ہے۔ وہ اندھیرا ہوتے ہی یہاں سے الگ الگ راستوں سے ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ جنگلات کا جو ملازم میرے لیے راشن لے کر آتا ہے ان سے ملا ہوا ہے اور اگر اسے گرفتار نہ کیا گیا تو وہ بھی آج رات کو فرار ہو جائے گا۔ ڈاکوؤں نے

ٹیلے فون کے تار کاٹ دیے ہیں اور میں ٹاور میں قید ہوں۔

یہ پرچہ لکھ کر جمال نے کافی کے اس خالی ڈبّے میں رکھ دیا جو اُس نے بڑے ڈبّے میں دلیے کے اوپر رکھ دیا تھا۔ پھر اس نے گھڑی اٹھائی اور چابی بھر کر ساڑھے پانچ بجے کا الارم لگا دیا۔ گھڑی کو بھی اس نے کوفی کے ڈبّے میں رکھ دیا اور ڈبّا بند کر دیا۔ پھر جو دلیہ پلیٹ میں نکالا تھا وہ اُس پر ڈال دیا تاکہ کوفی کا ڈبّا اُس میں بالکل چھُپ جائے۔ اب اُس نے ڈبّے کو ہاتھ میں لے کر وزن کا اندازہ کیا پھر کان سے لگا کر سُنا کہ گھڑی کی ٹِک ٹِک کی آواز تو نہیں آ رہی۔ جب ہر طرح اطمینان ہو گیا تو ڈبے کو دوبارہ شیلف پر رکھ دیا۔ کسی کو شبہ بھی نہ ہو سکتا تھا کہ اس میں دلیے کے علاوہ کوئی چیز ہے۔ تین منٹ بعد وہ پھر خاموشی سے اوپر نگرانی کے کمرے میں پہنچ گیا۔

کوئی گھنٹہ بھر بعد ٹاور کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور نیچے سے راشن لانے والے آدمی نے پکار کر جمال سے پوچھا کہ کیا اس نے سامان کی فہرست تیار کر لی ہے۔ جمال نے فہرست نیچے پھینک دی۔ ڈاکوؤں کے سرغنے نے یہ دیکھنے کے لیے کہ کوئی خفیہ پیغام تو نہیں لکھا فہرست پر ایک نظر ڈالی پھر راشن لانے والے آدمی کے حوالے کر دی۔

پھر جمال نے اوپر سے پکار کر کہا۔ ”دلیے کا ڈبا جو تم پچھلی دفعہ لائے تھے خراب ہے۔ اس کو واپس کر کے دوسرا ڈبا لیتے آنا۔“

”چھوڑو اِسے، پڑا رہنے دو جیسا بھی ہے۔“ اس نے جھلا کر کہا۔

”نہیں، اس ڈبے کو لے جاؤ۔ ڈاکوؤں کے سرغنے نے حکم دیا۔“ اس سے ظاہر ہو گا کہ سب ٹھیک ہے۔“

”لاؤ کہاں ہے، وہ دلیے کا ڈبّا۔“ راشن والے آدمی نے پوچھا۔

جمال نے اوپر سے چلا کر کہا کہ سامنے شیلف پر رکھا ہے۔ راشن لانے والے آدمی نے وہ ڈبّا شیلف پر سے اٹھایا اور ایک لمحے کے لیے جمال کے دل کی دھڑکن رُک گئی۔ مگر اس نے ڈبّے کو بیگ میں رکھ لیا اور روانہ ہو گیا۔

۳

سورج آہستہ آہستہ پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا اور وادی میں اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ ڈاکوؤں کے سرغنے نے جمال کو آواز دی کہ وہ نیچے آئے۔ جیسے ہی وہ نیچے آیا، دو ڈاکوؤں نے لپک کر اُسے پکڑ لیا اور دو منٹ کے اندر اُس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر فرش پر ڈال دیا۔ پھر ڈاکوؤں کا سرغنہ اُس سے بولا:

”تم حوصلہ مند لڑکے ہو اور مجھے تمھیں اس طرح باندھ کر یہاں چھوڑ جانے کا افسوس ہے۔ لیکن تم نے سب کچھ دیکھ لیا ہے اور ہم تمھیں آزاد نہیں چھوڑ سکتے کہ ہمیں پکڑوا دو۔ اگر سب ٹھیک رہا تو دو تین دن بعد میں کسی کو بھیج دوں گا کہ تمھیں آ کر کھول دے۔ یہ پانی اور کھانے کا سامان تمھارے پاس فرش پر رکھا ہے۔ ایک دو دن تو گزر ہی جائیں گے۔“

جمال سوچنے لگا کہ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ اوپر کھڑکی میں سے کود جاتا۔ اس طرح بندھے ہوئے اور اتنے تھوڑے سے پانی اور بسکٹوں سے وہ کتنے دن زندہ رہ سکے گا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا مگر اس نے ہمّت سے کام لیا اور ڈاکوؤں پر اپنی پریشانی اور ڈر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اُس نے سوچا، اللہ مددگار ہے، مشکل وقت میں وہی اپنے بندوں کا سہارا ہے اور اُسی سے مدد مانگنا چاہیے۔ اُس نے ایک ترکیب سے اپنا پیغام پہنچانے کی کوشش تو کی ہے شاید وہ کامیاب ہو جائے۔ اس خیال سے اس کی کچھ ڈھارس بندھی۔

”چلو، اب اندھیرا ہو گیا ہے، نکل چلنا چاہیے۔“ ڈاکوؤں کے سرغنے نے کہا اور وہ میز پر سے نوٹوں کے تھیلے اٹھا کر اندھیرے میں باہر نکل گئے۔

عین اسی وقت لوگوں کے دوڑنے اور مارنے کی آوازیں آئیں اور ایک دو گولیاں بھی چلیں۔ پھر کسی کی بھاری سی آواز آئی:

"انھیں اچھی طرح باندھ دو، کوئی زخمی تو نہیں ہوا، چلو اچھا ہے ہاں! وہ لڑکا کہاں ہے؟

"میں یہاں ہوں، ٹاور میں۔" جمال نے چیخ کر کہا۔

اسی وقت دروازے میں سے دو ٹارچوں کی روشنی اس پر پڑی، اور ایک آدمی جو پولیس انسپکٹر کی وردی میں تھا لپک کر اندر آیا اور اُس نے آگے بڑھ کر جمال کی رسیاں کاٹ دیں۔ پھر اُس نے باہر ٹارچ کی روشنی پھینکی

جہاں وہ تینوں ڈاکو ہتھکڑیاں لگے پڑے تھے، اور کئی سپاہی ان کی نگرانی کر رہے تھے۔

"دیکھو وہ رہے تمھارے دوست۔" انسپکٹر نے جمال سے کہا، "راشن ڈبے والے کو بھی ہم نے پکڑ لیا ہے۔ ہمیں تمھارا پرچہ مل گیا تھا۔ تم نے واقعی کمال کر دیا۔ تمھیں گھڑی میں الارم لگانے کی خوب سوجھی۔ جس وقت یہ آدمی ڈبا واپس کرنے آیا تو میں بھی اتفاق سے وہیں دکان میں تھا۔ دکان دار نے اس سے ڈبا لے کر شیلف پر رکھ دیا اور چند منٹ بعد ڈبے کے اندر سے الارم بجنے لگا۔ ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ پھر جب دکان دار نے ادھر ادھر دیکھا اور دلیے کا ڈبا کھولا تو اندر سے الارم کی زوردار آواز سنائی دی۔ کوفی کا ڈبا نکال کر دیکھا تو گھڑی کے ساتھ تمھارا پرچہ ملا۔ میں نے اسی وقت کارروائی شروع کر دی۔ تمھاری ذہانت سے ڈاکو بھی پکڑے گئے اور رقم بھی مل گئی۔ تمھیں یقیناً انعام ملنا چاہیے۔"

اور واقعی جمال کو انعام ملا۔ اُس کو فاریسٹ کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے وظیفہ مل گیا۔ وہ جنگل کا دوست تھا اور یہی اس کی خواہش تھی کہ فاریسٹ آفیسر بن کر جنگل میں رہے۔

نونہال ادب

نونہالوں کے لئے دلچسپ اور مفید کتابیں

ستاروں کی دنیا	اکیسویں صدی میں ایک خلائی اسٹیشن پر سلمان فرید نے کیا دیکھا؟
موراسے فرار	سمندر کی طوفانی لہروں کا مقابلہ کرنے والا لڑکا وحشیوں کا کیسے مقابلہ کرتا ہے' یہ کہانی موراسے فرار میں پڑھیے
اسلام کے جانثار	ہمارے پیارے نبیؐ کے ان ساتھیوں کی داستان جنہوں نے اسلام کی خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے امت کے لئے مثال قائم کر دی۔
ہمت کے کرشمے	انسان کے حوصلے اور ہمت کی بارہ سچی کہانیاں
خلائی مسافر	خلا سے آنے والے مسافروں کا زمین پر کیسے استقبال ہوا؟
پادری کی روح	پندرہ بہت ہی دلچسپ کہانیوں کا مجموعہ
قراقرم کی وادی	قراقرم کی وادی میں دو بچوں کی مہم کی کہانی

(ہر کتاب کی قیمت ۸ روپے ہے)

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس

ہمدرد سینٹر ناظم آباد نمبر ۳ کراچی

پادری کی روح
ت کے کرشمے
خلائی مسافر
گلاب ڈھیری کا نیلام
جھیل کا راز
ثریا فرخ
پکڑے گئے
منصورنگر کی دولت